وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ

اور تمام بیاہی ہوئی عورتیں سوائے ان کے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہو چکے،(635) یہ تم پر اللہ کا

635- اَلْمُحْصَنٰتُ۔ مُحْصَنَةٌ کی جمع ہے جو حَصَنَ سے ہے اور اس کے اصل معنی قلعہ ہیں اور جمع حُصُوْنٌ آتی ہے ﴿مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾[الحشر: 2:59] ''کیا ان کے قلعے انہیں اللہ (کی سزا) سے بچالیں گے۔'' اور اسی سے تَحَصَّنَ ہے جس کے معنی ہیں قلعہ کو اپنا مسکن بنالیا اور اس سے تجاوز کر کے ہر قسم کے تَحَرُّدْ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے [دِرْعٌ حَصِيْنَةٌ] زرہ جو بدن کی حفاظت کرتی ہے۔ [فَرَسٌ حِصَانٌ] وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو بچاتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے ﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ﴾[یوسف: 48:12] ''مگر تھوڑا جو تم بچالو گے۔'' یعنی محفوظ مکان میں محفوظ کرو اور [اِمْرَأَةٌ حِصَانٌ] کے معنی ہیں عفیفہ اور ذُوْ حُرْمَةٍ یعنی پاکدامن اور عزت والی عورت اور احصان کے معنی نکاح کرنا ہیں ﴿فَاِذَآ اُحْصِنَّ﴾ [25] اور [مُحْصَنَةٌ حِصَانٌ] کو کہتے ہیں خواہ وہ بوجہ عفت کے محفوظ ہو یا بوجہ نکاح کے یا بوجہ اپنی بلند مرتبگی کے اور حریت کے۔ (غ) اور عورت مُحْصَنَةٌ ہوتی ہے بوجہ اسلام اور پاکدامنی اور آزادی اور نکاح کے۔ (ل) اور ان چاروں معنوں میں اس لفظ کا استعمال قرآن کریم میں ہوا ہے۔ پس مُحْصِنَاتٌ سے مراد مسلمان عورتیں یا پاکدامن عورتیں یا آزاد عورتیں یا منکوحہ عورتیں ہوسکتی ہیں۔

ملک یمین کا حکم:

اس آیت کی تفسیر مفسرین نے چار طرح پر کی ہے۔

اوّل محصنات سے مراد خاوند والی عورتیں لی جائیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے مراد وہ عورتیں لی جائیں تو جنگ میں قید ہو کر ملک یمین ہو جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ملک یمین سے ملک نکاح مراد لی جائے تو پہلی صورت میں معنی یہ ہوئے کہ خاوند والی عورتوں سے نکاح کرنا منع ہے۔ سوائے ان خاوند والی عورتوں کے جو ملک یمین میں آجائیں اور دوسری صورت میں یہ معنی ہوئے کہ خاوند والی عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ تمہاری ملک نکاح میں آجائیں بعد اس کے کہ ان کے پہلے خاوندوں سے جدائی واقع ہو جائے۔ کیونکہ جب تک پہلے خاوند سے جدائی نہ ہو، ملک نکاح میں ایسی عورت نہیں آسکتی۔

دوم مُحْصَنٰتٌ سے مراد آزاد عورتیں لی جائیں تو اس صورت میں بھی دو طرح پر معنی کے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے مراد وہ عدد لیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے حد مقرر کر دی ہے یعنی چار اور دوسرے یہ کہ ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے مراد یہ لی جائے کہ وہ عورتیں جو تمہارے قبضہ میں جائز طور پر آچکی ہیں یعنی ولی کی رضامندی سے اور گواہوں کی موجودگی و دیگر شرائط کے ساتھ۔ تو گویا ان دو صورتوں میں یہ معنی ہوئے کہ آزاد عورتیں چار کی تعداد سے زائد تمہارے لیے حرام ہیں یا یہ کہ آزاد عورتیں تمہارے لیے حرام ہیں سوائے اس کے کہ جائز طور پر وہ تمہارے نکاح میں

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ

فرض کیا ہوا ہے اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں (اس طرح) کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ (ان کو) چاہو نکاح میں لا کر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ (636) سو تم نے ان میں سے جس کے ساتھ نفع اٹھایا ہے انہیں

آئیں۔ان معانی میں سے مؤخرالذکر تین معنی پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور پہلے معنی بھی تھوڑے تدبر سے صاف ہو جاتے ہیں۔اس معنی کے لحاظ سے تمام منکوحہ عورتوں سے خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتی ہوں نکاح حرام ٹھہرایا گیا ہے اور یوں دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو بھی صحیح تسلیم کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو مسلمان کا نکاح کرنا جائز ہے سوائے ایک صورت کے کہ کوئی ایسی منکوحہ عورت ملک یمین ہو جائے تو اس صورت میں اس سے نکاح کر لینا جائز ہے۔ یہاں نکاح بغیر کسی قسم کا تعلق مرد وعورت کا ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا گیا، بلکہ صرف لونڈی سے نکاح کی اجازت ہے اور وہ نکاح دوسری شرائط کے ماتحت ہے جن میں سے بعض خاص شرائط کا ذکر آگے [آیت: 25] میں آتا ہے اور عام شرائط دوسری جگہ قرآن کریم میں موجود ہیں۔مثلاً یہ کہ مشرک عورت سے نکاح جائز نہیں وغیرہ۔

ان الفاظ کے ایک اور معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ تمام بیاہی ہوئی عورتیں تمہارے اوپر حرام ہیں سوائے ان بیاہی ہوئی عورتوں کے جن کے تمہارے اپنے داہنے ہاتھ مالک ہوں یعنی جو تمہارے اپنے نکاح میں ہوں۔اس صورت میں الا گویا استثنائے منقطع کا کام دے گا اور ترکیب اس طرح پر ہوگی کہ تمام بیاہی ہوئی عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لیے حرام ہے مگر جو عورتیں تم نے خود بیاہی ہیں وہ تم پر حرام نہیں۔ملک یمین سے مراد ملک نکاح نہ صرف مفسرین نے لیا ہے بلکہ لغت بھی اس پر شاہد ہے کیونکہ یمین کے معنی معاہدہ بھی ہیں اور نکاح ایک معاہدہ ہی ہے۔

636- ﴿ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ﴾ كِتٰبَ یہاں مصدر مؤکد ہے اور اس سے مراد ہے واجب یا فرض کیا گیا۔

﴿مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ اس کے سوا باقی عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہے۔لیکن بعض حالات میں اور وجوہات سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔وہ دوسری آیات کے ماتحت آتی ہیں۔مثلاً تین بار کی مطلقہ ﴿لَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرة: 230:2] ''تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے۔'' یا مشرکہ عورت ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ﴾ یا چار کے بعد پانچویں عورت۔ یا جس سے لعان ہو چکا ہے جس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا [لَا يَجْتَمِعَانِ أَبَدًا] (سنن أبي داؤد، كتاب13، باب27، 2252)

مُسٰفِحِيْنَ۔ سَفَحَ خون یا پانی کے بہانے کو کہتے ہیں اور سَفَاحٌ یا مُسَافِحَةٌ کے معنی ہیں عورت کا مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں رہنا اور صحیح طور پر ان کا عقد نہ ہونا کیونکہ اس سے مقصود پانی کا بہانا یا شہوت رانی ہے اور فریقین کے کوئی حقوق اور

اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ان کے مقررشدہ مہر دے دو۔[637] اورتم پر اس کے

ذمہ داریاں پیدانہیں ہوتیں۔

یہاں پچھلی آیت کے مضمون کو صاف کر دیا۔ جو عورتیں حرام ہیں ان کو گن کر بتایا کہ جو عورتیں حلال ہیں ان کے ساتھ تعلق اس صورت میں ہو کہ مہرے دے کر انہیں قید نکاح میں لایا جائے اور بغیر نکاح کے ان کے ساتھ فجور کی حالت میں نہ رہیں۔ قید نکاح میں لانے کی شرط کافی تھی ﴿غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ ان خیالات کی تردید ہے جو جدید تہذیب کے ساتھ پھیل رہے ہیں کہ قید نکاح میں خواہ مخواہ کی پابندی ہے۔ قدرتی حالت میں مرد و عورت کا رہنا کافی ہے۔ یعنی جس طرح حیوانات میں ایک جوڑا بن جاتا ہے اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت بلا قید نکاح کے مل کر رہ لیا کریں۔

637- اسْتَمْتَعْتُمْ۔ اصل اس کا مَتَعَ ہے اور متاع کے معنی ہیں ایسا نفع اٹھانا جو لمبے وقت کے لیے ہو۔ (غ) ﴿وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ [یونس: 98] ''اور ایک وقت تک ان کو سامان دیا۔'' ﴿نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا﴾ [لقمان: 24:31] ''ہم انہیں تھوڑا سا سامان دیتے۔'' ﴿سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [ھود: 48:11] ''جنہیں ہم کچھ سامان دیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔'' اور اِسْتِمْتَاعٌ کے معنی ہیں طلب تمتع یعنی انتفاع ممتد الوقت کا طلب کرنا۔ ﴿رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ [الأنعام: 128:6] ''اے ہمارے ربّ! ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا۔'' ﴿فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ﴾ [التوبة: 69:9] ''پس تم بھی اپنے حصے سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا رہے ہو جیسے ان لوگوں نے جو تم سے پہلے تھے اپنے حصے سے تھوڑا سا فائدہ اٹھایا۔'' اور عام محاورہ میں کہتے ہیں [اِسْتَمْتَعَ الرَّجُلُ بِوَلَدِهٖ] یعنی آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اٹھایا۔ پس اِسْتِمْتَاعٌ کے معنی محض نفع اٹھانے کے ہیں نہ تعلقات زنا شوئی اور مُتْعَةٌ کے معنی یوں کیے گئے ہیں [اَلتَّمَتُّعُ بِالْمَرْأَةِ لَا تُرِيْدُ اِدَامَتَهَا لِنَفْسِكَ] (ل) یعنی عورت سے فائدہ اٹھانا جس کو تم اپنے لیے ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ یا جیسا کہ امام راغب رحمہ اللہ نے لکھا ہے: [اِنَّ الرَّجُلَ كَانَ يُشَارِطُ الْمَرْأَةَ بِمَالٍ مَعْلُوْمٍ يُعْطِيْهَا اِلٰى اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ فَاِذَا انْقَضَى الْاَجَلُ فَارَقَهَا مِنْ غَيْرِ طَلَاقٍ] یعنی ایک مرد ایک عورت سے شرط کر لیتا تھا کہ ایک معین مقدار مال کی اسے دے گا اور ایک وقت مقرر تک اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ اور جب وہ مدت گزر جاتی تو بغیر طلاق کے اس سے الگ ہو جاتا۔

اُجُوْرٌ۔ اَجْرٌ کی جمع ہے جو اصل میں تو وہ چیز ہے جو ثواب عمل سے انسان کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ مگر عورت کے مہر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

استمتاع اور متعہ میں فرق:

ان الفاظ کی تاویل میں اہل تشیع کو یہ سخت غلطی لگی ہے کہ یہاں لفظ اسْتَمْتَعْتُمْ سے انہوں نے متعہ یا عارضی نکاح کا جواز نکالا ہے۔ حالانکہ اِسْتِمْتَاعٌ عام ہے اور مُتْعَةٌ خاص معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر لغت کے حوالہ سے دکھایا گیا ہے۔

بڑے اور چھوٹے انسانوں کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا اور باپ کا بیٹے سے فائدہ اٹھانا اِسْتِمْتَاعٌ ہے اور اس کے معنی عارضی نکاح لینا صریح غلطی ہے۔ زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ اس آیت کے معنی میں ایک قوم نے بوجہ لغت سے جہالت کے بڑی سخت غلطی کھائی ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ گو متعہ کا ذکر یہاں مقصود نہ ہو۔ مگر کیا ان الفاظ کے اندر ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ﴾ متعہ کا مفہوم شامل نہیں ہوسکتا؟ کیونکہ اِسْتِمْتَاعٌ کے معنی طلب منفعت ہیں اور متعہ میں بھی طلب منفعت ہے۔ الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن شریف نے قید لگادی ہے کہ تم اپنے مال عورتوں پر اس رنگ میں خرچ کرو کہ ان کو قید نکاح میں لاؤ اور قید نکاح جب ایک دفعہ عائد ہوجائے گی تو اس سے زوجین کی زندگی میں نکلنے کی صورت سوائے طلاق کے اور کوئی قرآن شریف میں مذکور نہیں۔ پس ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ﴾ جو بطور نتیجہ وارد ہوا ہے وہ بھی اسی حالت یعنی قید نکاح کے متعلق ہی ہوسکتا ہے۔

نکاح اور مسافحت:

قرآن شریف نے اِحْصَانٌ یعنی نکاح کے مقابلہ پر مُسَافِحَتٌ یعنی شہوت رانی کو رکھا ہے ﴿مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ گویا جو احصان نہیں وہ مسافحت ہے اس لیے متعہ کو ہمیں ان دونوں میں سے ایک میں شامل کرنا پڑے گا۔ احصان اور مسافحت میں امر مشترک اس قدر ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کا تعلق ہوتا ہے دونوں میں امتیاز یہ ہے کہ احصان میں مرد عورت کا تعلق ساری عمر کے لیے ہوتا ہے اور مسافحت میں نہیں۔ احصان میں عورت کے مرد پر کچھ حقوق پیدا ہوتے ہیں مثلاً ایک دوسرے کی زوجیت میں مرجائے تو حق وراثت پیدا ہوتا ہے، مسافحت میں پیدا نہیں ہوتا۔ احصان میں اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہے، مسافحت میں نہیں۔ پس احصان میں وہی امر داخل ہوسکتا ہے جو اس کے امتیازی پہلوؤں میں اس کا شریک ہو۔ اب متعہ میں ایک مرد و عورت کا تعلق ہے اس حد تک اس کا مسافحت کے ساتھ اشتراک ہے اور احصان کی کوئی امتیازی خصوصیت اس کے اندر نہیں پائی جاتی۔ متعہ میں نہ تو کوئی تعلق عمر بھر کے لیے ہوتا ہے اور نہ اگر مرد و عورت میں سے ایک دوسرے کی زوجیت میں فوت ہوجائے تو کوئی حقوق وراثت پیدا ہوتے ہیں، نہ اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے۔ اس لیے صریحاً متعہ مسافحت میں داخل ہے نہ احصان کے اندر اور اگر یہ کہا جائے کہ متعہ میں اعلان ہوتا ہے تو اعلان ایک گونہ مسافحت میں بھی ہوتا ہے۔ مسافحت کے معنی ہی علی الاعلان مرد اور عورت کا اکٹھا رہنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مسافحت کے ساتھ ایک جگہ چھپی آشنائی کو الگ بیان کیا ہے۔ ﴿مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾ [المآئدۃ: 5:5] ''نکاح میں لانے والے نہ کھلی بدکاری کرنے والے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے۔'' یہاں ان لوگوں کے لیے بھی جواب ہے جو نکاح کی غرض صرف شہوت رانی سمجھتے ہیں۔ اسلام نے نکاح کی غرض کو شہوت رانی سے اس قدر بلند قرار دیا ہے کہ شہوت رانی کو ناجائز قرار دیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ نکاح صرف اس غرض کے لیے نہیں کہ مرد و عورت کے جذبات شہوت رانی پورے ہوں بلکہ اس کی غرض بعض حقوق و ذمہ داریوں کا پیدا کرنا ہے جن سے تمدن و معاشرت انسانی کی بنیاد پڑتی ہے۔ نیز [دیکھو نمبر: 639] میں اَخْدَانٍ کی تشریح۔

احادیث میں متعہ کی حرمت:

ہاں یہ سچ ہے کہ متعہ عرب میں مروج تھا۔ اس لیے اگر نزول حکم قرآنی سے پہلے نبی کریم ﷺ نے اس کی اجازت دی ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ علاوہ ازیں اگر روایات میں اجازت پائی جاتی ہے تو ممانعت بھی پائی جاتی ہے۔ اجازت نزول حکم سے پہلے کی ہے اور جب قرآن شریف میں حکم نازل ہو گیا تو روایات میں بھی ممانعت آ گئی۔ اب اجازت کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شراب کے متعلق کسی روایت کو پیش کر دے کہ فلاں وقت فلاں صحابی نے شراب پی تھی۔ چنانچہ اس کے مطابق صحیح مسلم میں سبرہ بن معبد کی روایت اپنے باپ سے ہے:[أَنَّ أَبَاهُ غَزَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ فَقَالَ: يَأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي قَدْ كُنْتُ أَذِنْتُ لَكُمْ فِي الاِسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ وَإِنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ ذٰلِكَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ مِنْهُنَّ شَيْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيلَهَا] (صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب نِكَاحِ الْمُتْعَةِ وَبَيَانِ أَنَّهُ أُبِيحَ ثُمَّ نُسِخَ ثُمَّ أُبِيحَ ثُمَّ نُسِخَ وَاسْتَقَرَّ تَحْرِيمُهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ: 3488) یعنی اس نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جنگ کی تو آپ نے فرمایا کہ ''اے لوگو! میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی اور اللہ نے اس کو قیامت کے دن تک حرام کر دیا ہے۔ پس جس شخص کے پاس ایسی کوئی عورت ہے اس کا راستہ آزاد کر دے۔'' اور دوسری روایت صحیحین کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن عورتوں کے متعہ سے روک دیا اور گھریلو گدھوں کے گوشت کھانے سے اور تیسرا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کا نہایت صاف ہے جس کے متعلق ابن ماجہ میں اسناد صحیح سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ پڑھا[فَقَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَذِنَ لَنَا فِي الْمُتْعَةِ ثَلاَثًا ثُمَّ حَرَّمَهَا وَاللهِ لَا أَعْلَمُ أَحَدًا تَمَتَّعَ وَهُوَ مُحْصَنٌ إِلَّا رَجَمْتُهُ] (سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب النهي عن نكاح المتعة: 1963) یعنی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو تین مرتبہ متعہ کی اجازت دی پھر اس کو حرام کر دیا اور مجھے جس شخص کے متعلق علم ہو گا کہ اس نے باوجود نکاح شدہ ہونے کے متعہ کیا ہے میں اسے سنگسار کروں گا۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم اس کی مخالفت کرتے۔ مگر کوئی شخص اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا خود اس پر اتفاق تھا کہ رسول اللہ ﷺ متعہ کو حرام کر چکے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عام طور پر متعہ کی اجازت کبھی نہیں دی بلکہ صرف دو دفعہ جنگ کے موقعہ پر دی تھی اور وہ قریباً حالت اضطراری ہوتی ہے مگر بعد میں اسے بھی روک دیا۔ پس روایات متعہ کو مان کر بھی اس کا عام جواز جیسا اہل تشیع میں مروج ہے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

متعہ کب حرام ہوا:

البتہ سوال تاریخ کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ کب متعہ حرام ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت مندرجہ بالا میں یہ ذکر ہے کہ متعہ خیبر کے دن حرام ہوا اور سبرہ کی روایت میں ہے کہ فتح مکہ میں حرام ہوا۔ ہم کو اس بارہ میں کسی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ آیت خیبر کے دن نازل ہوئی تو اس وقت حرام ہوا ہو گا اور اگر فتح مکہ کے دن تو اس وقت۔ البتہ اگر حرمت خیبر کے دن تسلیم کی جائے تو اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ غزوہ اوطاس میں جو اس کی اجازت پائی جاتی ہے جس کا وقوع فتح کے سال ہوا وہ بے معنی ٹھہرتی ہے۔ ممکن ہے اس روایت میں کسی راوی کو غلطی لگی ہو اور ممکن ہے جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحیحین

فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

متعلق کوئی گناہ نہیں تم مقرر کرنے کے بعد آپس میں رضامند ہو جاؤ۔ اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔(638)

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ

اور جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے (نکاح کرلے) جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک

والی روایت میں غلطی ہوگئی ہے اور لفظ [يَوْمَ خَيْبَرَ] بجائے [أَكْلِ لُحُومَ الْحُمُرِ] کے [مُتْعَةِ النِّسَاءِ] کے ساتھ لگ گئے ہیں اور اس کی تائید بلاشبہ کئی واقعات سے ہوتی ہے جیسا کہ امام ابن قیم نے لکھا ہے۔ اول امام احمد کی اس روایت سے جو سفیان بن عیینہ نے کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں [أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ حَرَّمَ لُحُومَ الْحُمُرِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَ حَرَّمَ مُتْعَةَ النِّسَاءِ] (مسند احمد مؤسسة الرسالة، حديث:592 حاشية) یعنی رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن گدھے کے گوشت کو حرام فرمایا اور عورتوں کے متعہ کو حرام کیا۔ تو گویا یوں خیبر کا لفظ گدھوں کی حرمت کے متعلق تھا۔ کسی راوی نے اس کو متعہ النساء کے متعلق کر دیا۔ اور اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خیبر کے دن کوئی متعہ کا سوال پیش نہیں ہوا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو اِن دو باتوں کو اکٹھا کیا تو اس لیے نہیں کہ ان کی حرمت ایک دن ہوئی بلکہ اس لیے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ان دونوں مسائل میں دوسرا پہلو اختیار کرتے تھے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کا اکٹھا ذکر کیا۔ گو وہ الگ الگ وقت کے واقعات تھے۔

متعہ کے بارہ میں سیدنا ابن عباسؓ کا مذہب:

باقی رہا سوال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعہ کو حلال کہنے کا، سو اس کی تشریح انہوں نے خود ان الفاظ میں کر دی [قُلْتُ اِنَّمَا تَحِلُّ لِلْمُضْطَرِّ كَمَا تَحِلُّ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرُ لَهُ] میں نے کہا تھا کہ وہ مضطر کے لیے حلال ہے جس طرح اس کے لیے مردار اور خون اور سور کا گوشت حلال ہے۔ پس اضطرار کی حالت میں حلال قرار دینا یہ حلت کا فتویٰ نہیں۔ بلکہ حرمت کا فتویٰ ہے اور بعد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے بکلی رجوع کر لیا۔

638- یہاں جس رضامندی کا ذکر ہے وہ **مہر کی کمی یا بیشی کے متعلق ہے**۔ یعنی مہر مقرر ہو جانے کے بعد میاں بی بی کی رضامندی سے کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی۔ اس آیت کا خاتمہ ﴿عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ پر کیا ہے۔ گویا بتایا ہے کہ قید نکاح کی پابندی بڑے علم و حکمت پر مبنی ہے اور یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو مرد اور عورت کے آزادانہ تعلقات کے حامی ہیں اور نکاح کی قید کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرف اقوام یورپ کا میلان ہے جن میں ولد الزنا بچوں کی نہ صرف کثرت ہوگئی ہے بلکہ ان پر فخر کیا جاتا ہے۔

اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع 4 3 1

ہوئے اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ تم آپس میں ایک ہی ہو سو انہیں ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے موافق ان کے مہر دے دو پاک دامن ہوں نہ کھلی بدکاری کرنے والی اور نہ در پردہ آشنا رکھنے والی۔ پھر جب نکاح میں لائی جائیں تو اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی ہے۔ یہ تم میں سے اس کے لیے ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا خوف ہو اور اگر تم صبر کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (639)

639- طَوْلٌ۔ طُوْلٌ لمبائی کو کہتے ہیں اعراض میں ہو یا جواہر میں اور طول فضل اور من سے یعنی بزرگی یا زیادتی مال اور احسان سے مخصوص ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی آتا ہے ﴿ذِي الطَّوْلِ﴾ [المؤمن: 3:40] یعنی حقیقی فضل و من کا مالک وہی ہے اور ﴿اُولُوا الطَّوْلِ﴾ [التوبة: 86:9] سے مراد صاحب وسعت لوگ ہیں اور یہاں بھی معنی فراخی یا وسعت ہی ہیں اور مراد اس قدر مال ہے جس کو مہر اور نفقہ میں دے سکے۔ (غ)

الْمُحْصَنٰتِ سے مراد یہاں آزاد عورتیں ہیں کیونکہ ان کے مقابلہ میں لونڈیوں کا ذکر ہے۔

فَتَيٰتِ۔ فَتَاةٌ کی جمع ہے جو فَتٰی کی مونث ہے اور فَتٰی اصل میں اس کو کہتے ہیں جو تازہ جوانی کو پہنچا ہو۔ اور مراد اس سے غلام اور فَتَاةٌ سے مراد لونڈی لی جاتی ہے۔

﴿بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ﴾ اَهْلٌ کے معنی [نمبر: 137] میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں مراد اس سے مولیٰ یا مالک ہے۔ مالک کی اجازت کی شرط اس لیے ہے کہ نکاح سے مالک کے بہت سے فوائد خدمت اور کام لینے کے کم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث سے ثابت ہے کہ جس طرح لونڈیاں اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتیں اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا۔ [اَيُّمَا عَبْدٍ تَزَوَّجَ بِغَيْرِ اِذْنِ مَوَالِيْهِ فَهُوَ عَاهِرٌ] ''جو غلام اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کے لیے پتھر ہیں۔'' (ث)

اَخْدَانٍ۔ خِدْنٌ کی جمع ہے جس کے معنی صاحب یا صدیق ہیں اور اس کا اکثر استعمال ایسے شخص کے حق میں ہیں جو شہوت کی وجہ سے مصاحب ہو۔ (غ) مسافحت کے ساتھ اِتِّخَاذِ اَخْدَانْ کے ذکر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ میں چھپی ہوئی آشنائی کی

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے کھول کر بیان کر دے اور تم کو

طرف اشارہ ہے چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مسافحات کے معنی [اَلزَّوَانِيْ اَلْمُعْلِنَاتِ] کیے ہیں یعنی جو علی الاعلان زنا کرتی ہیں۔ اور بیضاوی میں اَخْدَانٌ کے معنی کیے ہیں: [اَلْاَخِلَّآءُ فِي السِّرَّاءِ] ''در پردہ آشنائی کرنے والی۔''

لونڈیوں سے نکاح:

اس آیت میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کے احکام اور شرائط بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں دو جگہ آتا ہے: ﴿لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ [المؤمنون: 5, 6] [المعارج: 29, 30] ''اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں سے یا ان سے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔'' پس جب ازواج یعنی بیبیوں کے متعلق احکام بیان کر دیئے تو ضروری تھا کہ ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ کے متعلق بھی احکام کو بیان کر دیا جاتا جس طرح ایک آزاد عورت کو زوجیت میں لینے کی شرائط اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی ہیں۔ اسی طرح ﴿مِّمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ کے ساتھ تعلقات زنا شوئی قائم کرنے کے احکام بھی اس جگہ بیان کر دیئے ہیں تاکہ نکاح کا مضمون مکمل ہو جائے اور لونڈیوں کا ذکر الگ کر کے اور ان کے ساتھ آزاد مردوں کے نکاح کو بعض سخت شرائط کے ساتھ مشروط کر کے یہ بتا دیا ہے کہ قرآن کریم ﴿مِّمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ کو ازواج سے الگ رکھتا ہے اور سوائے سخت مجبوری کے ان کے ساتھ نکاح سے روکتا بھی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن شریف لونڈیوں کے متعلق یہی چاہتا ہے کہ وہ بلا نکاح یا حالت فجور میں رہیں۔ بلکہ اس سے صاف منع کرتا ہے ﴿وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ﴾ [النور: 33:24] ''اور اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور مت کرو۔'' اور ان کو نکاح سے روکنا انہیں زنا پر مجبور کرنا ہے۔ پھر صاف الفاظ میں حکم دیتا ہے ﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ﴾ [النور: 32:24] ''اور جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہیں۔'' یہاں صاف صالح غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کر دینے کا حکم دیا ہے۔ پس اصل منشا قرآن کریم کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لونڈیوں اور غلاموں کے آپس میں نکاح ہوں اور سوائے سخت ضرورت کے آزاد مرد یا عورت کی لونڈی یا غلام سے زوجیت نہ ہو۔

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ذلیل حالت میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے باہمی تعلقات نکاح کو روکتا ہے اس کا جواب خود اسی آیت میں دیا ہے ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ غلام اور لونڈیاں، آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسل انسانی کے افراد ہیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل بتاتا کہ غلاموں اور لونڈیوں سے کھانے پینے میں، لباس میں، کام کے لینے میں مساوات کا سلوک ہوتا تھا۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ نکاح کے تعلقات پر ایسی سخت شرائط لگا دی ہیں، یہاں تک کہ ﴿اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ میں فرما دیا کہ ممکن ہو تو نہ ہی کرو۔

پس جب مساوات کو بھی تسلیم کیا ہے بلکہ غلاموں لونڈیوں کے ساتھ مساوات کے سلوک کا حکم دیا ہے تو نکاح سے ممانعت اس بنا پر نہیں ہو سکتی کہ ان کو ہمیشہ کے لیے ذلیل اور کم حیثیت پر رکھنا چاہا ہے۔ لیکن کوئی غرض ضرور ہے۔ اس غرض کا پتہ ہم کو خود نبی

سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ ان کی راہیں دکھادے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر توجہ

کریم ﷺ کی زندگی سے لگتا ہے اور بعض احادیث سے بھی اس مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کسی لونڈی سے اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھ کر نکاح نہیں کیا۔ بلکہ آزاد کر کے اور اس کو زوجیت کے پورے حقوق دے کر نکاح کیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ملک یمین میں داخل تھیں نبی کریم ﷺ نے ان کو آزاد کیا اور ان کو قریشی بیبیوں کے برابر زوجہ ہونے کی حیثیت دی۔ یہی حالت حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی معلوم ہوتی ہے جن کے بطن سے ابراہیم پیدا ہوئے۔ شاہ مصر نے انہیں بطور ایک لونڈی کے آپ کی طرف بھیجا تھا مگر آپ نے اس کو بھی اتنا مرتبہ دیا کہ وہ حجاب میں رہتی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زوجیت میں داخل تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اس حکم کے ماتحت ﴿وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا﴾ [الأحزاب: 53:33] یعنی ''تمہارے لیے جائز نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج سے آپ کے بعد کبھی نکاح کرو۔'' حضرت ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آنحضرت ﷺ کے بعد نہیں ہوا۔ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ان کی وفات تک ان کو دیگر ازواج کی طرح برابر نفقہ دیتے رہے۔ ایسا ہی ریحانہ رضی اللہ عنہا کا حال ہے جن کے متعلق ایک روایت میں صاف ذکر ہے کہ آپ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا اور جب آپ کی دوسروں کو یہ تعلیم تھی کہ لونڈیوں کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرو تو خود ایسا کیوں نہ کرتے۔ چنانچہ بخاری [بَابُ اَجْرِ مَنْ أَسْلَمَ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابَيْنِ] میں ذیل کی روایت ہے [الرَّجُلُ تَكُونُ لَهُ الْأَمَةُ فَيُعَلِّمُهَا فَيُحْسِنُ تَعْلِيمَهَا، وَيُؤَدِّبُهَا فَيُحْسِنُ أَدَبَهَا، ثُمَّ يُعْتِقُهَا فَيَتَزَوَّجُهَا، فَلَهُ أَجْرَانِ] (صحيح البخاري، كتاب الجهاد، حديث: 3011) یعنی ''جس شخص کے پاس ایک لونڈی ہو پھر وہ اس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کو آداب سکھائے اور اچھے آداب سکھائے اور اسے آزاد کرے اور نکاح کرے تو اس کے لیے دو چند اجر ہے۔'' پس لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت میں اول حکمت تو یہی تھی کہ تا مسلمان ان کو آزاد کر کے ان کو اپنی زوجیت میں لیں اور لونڈی کو ادنیٰ حالت میں نہ رہنے دیں۔ ہاں لونڈی کی یہ قدر آنحضرت ﷺ نے سکھائی کہ اس کی احسن تعلیم اور احسن تادیب کی طرف توجہ دلائی۔ مگر آج مسلمان اپنی بیٹیوں کی بھی اتنی عزت نہیں کرتے اور ان کی مناسب تعلیم و تادیب کا کوئی انتظام نہیں۔

دوسری حکمت اس میں یہ تھی کہ جو حالت ملک عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کی تھی یا جو اور دنیا میں تھی اس کی وجہ سے ان میں بہت سے ذلیل اخلاق آ چکے تھے اور ماں چونکہ اولاد کی تربیت کرتی ہے اور اولاد کے اخلاق ماں کے اخلاق سے ہی بنتے ہیں اس لیے اگر لونڈیوں سے عام اجازت نکاح کی ہوتی تو اخلاق قومی پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشرک عورتوں کے نکاح سے بھی اسلام نے روک دیا اس لیے کہ ان کا اثر اولاد کی تربیت پر برا پڑتا تھا اور اخلاق بگڑتے تھے۔ یہاں چونکہ مومن ہو کر ان کو ایک موقعہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کا بھی تھا اس لیے مشروط اجازت دی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض لونڈیاں اس ذلت کی حالت سے نکل بھی سکتی تھیں تو ایسے غلاموں اور لونڈیوں کے لیے اسلام نے مکاتبت کی شرط رکھی ہوئی تھی اور ہر ایک غلام اور لونڈی کو جو اپنی حالت کی اصلاح کرنا چاہے یہ حق تھا کہ وہ مالک سے آزادی حاصل کرے۔ پس ان کے لیے آزاد ہو کر اور زوجیت میں مساوات کے حقوق حاصل کر کے نکاح کر لینے کا رستہ کھلا تھا۔

عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ فرمائے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (640)

لونڈیوں سے نکاح کی شرائط:

تیسری حکمت اس میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو قیدی جنگ میں پکڑے جاتے تھے ان کے متعلق حکم تھا کہ ان کو بعد میں احسان سے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے ایسی صورت میں بھی ممکن تھا کہ ان کے پہلے خاوند اگر زندہ ہوں تو اسلام لے آئیں اور اس صورت میں انہیں واپس اپنے خاوندوں کے پاس جانا چاہیے۔ لونڈی کے ساتھ جو نکاح میں جو شرائط رکھی ہیں وہ یہ ہیں۔

1. اول یہ کہ ایک مرد اس قدر فراخی اور وسعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے۔ کیونکہ لونڈی کا مہر اس کا نفقہ آزاد عورت سے بہت کم ہوتا تھا۔
2. دوسرے یہ کہ عَنَتْ سے خائف ہو یعنی اگر نکاح نہ کرے تو کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ صحت جسمانی بگڑنے کا یا زنا میں پڑ کر ہلاکت میں پڑنے کا۔
3. تیسری شرط یہ ہے کہ مالک کے اذن کے ساتھ نکاح ہو۔
4. چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ لونڈی مومنہ ہو۔

مالک اور مملوک لونڈی:

ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا مالک کے لیے محض ملک یمین کی وجہ سے لونڈی سے زن و شوہر کا تعلق رکھنا جائز ہے یا وہ بھی ان شرائط کے ماتحت ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ جہاں تک موجودہ زمانہ کا سوال ہے نہ وہ دینی جہاد اس وقت ہیں نہ ملک یمین کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تاہم ایک مسئلہ کے رنگ میں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر غیر مالک کو لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے سے حتی الوسع روکا ہے، وہی وجوہات مالک کے لیے موجود ہیں۔ بلکہ مالک کے لیے تو اور بھی آسان راہ ہے کہ اگر کوئی ملک یمین والی عورت اس کو پسند آئے تو وہ آزاد کر کے اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں آزادی عطا کرنا ہی مہر کے قائمقام بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی حالت میں ہوا۔ اس لیے اس کے لیے کوئی مشکل بھی نہیں۔ لیکن جب تک وہ اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھنا چاہتا ہے وہ ان تمام شرائط کا پابند ہے۔ ہاں بعض شرائط اس کی حالت میں خود زائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مالک کے اذن سے نکاح کیا جائے سو اس کو کوئی اذن بکار نہیں۔ یا مثلاً یہ کہ مہر دیا جائے کیونکہ لونڈی کا مال مالک کا مال متصور ہوتا ہے اس لیے اس کو مہر دینے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا اعلان سو وہ ضروری ہے۔

640- **شرائع کا نزول:** پچھلے رکوعوں میں عورتوں کی وراثت اور حقوق اور نکاح کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ اس رکوع میں اصل غرض تو ان حقوق کی محافظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہے۔ مگر پہلی تین آیتوں میں نزول شریعت کے متعلق چند باتیں بتائی ہیں یعنی یہ کہ کیا ضرورت پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے احکام نازل کرے۔ چنانچہ اس آیت میں بتایا ہے کہ اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کھول کر بیان کرے اور ساتھ ہی توجہ دلائی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قدیم قانون ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر

وَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْكُمْۗ-وَ یُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا(۲۷)

اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر توجہ فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ جھک جاؤ۔ (641)

یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْۚ-وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا(۲۸)

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کر دے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے۔ (642)

ملک میں ایسا کرتا آیا ہے ﴿سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ میں یہی اشارہ ہے۔

641- **نزول شریعت کی غرض:** اس آیت میں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح پر شریعت کو تم پر نازل کرنا اس لیے ہے کہ وہ تم پر خصوصیت سے توجہ فرمانے کا ارادہ کر چکا ہے تا کہ اس کی خاص توجہ سے صحیح اصول پر چل کر تم دنیا میں عظیم الشان قوم بن جاؤ۔ مگر جو لوگ نری خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح میانہ روی سے ایک طرف جھک جاؤ اور جادۂ اعتدال سے منحرف ہو جاؤ۔ یہ لوگ کون ہیں؟ بعض نے کہا زانی، بعض نے کہا یہودی و نصاریٰ، بعض نے مجوس۔ لیکن قرآن کریم نے لفظ عام رکھے ہیں۔ شہوات کی پیروی کرنے والے جو کوئی بھی ہوں ہاں اگر خصوصیت سے کسی ایک قوم پر یہ لفظ چسپاں ہیں تو عیسائیوں پر کیونکہ وہ نہ صرف عملاً خواہشات کی پیروی کرتے ہیں بلکہ شریعت سے ایسے متنفر ہیں کہ اس کو نعوذ باللہ لعنت تک کہہ دیا ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں بھی بجائے اسلام کی طرح سادگی کے ساتھ ان کے حقوق دینے کے اپنی خواہشات نفسانی کے لیے ان کے باہر بناؤ سنگار کر کے نکلنے پر ہی سارا زور دیتے ہیں۔ اور اسی کو عورت کا بڑا حق قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اصل حقوق جو اسلام نے عورت کو دیئے ہیں ان کی طرف توجہ بھی نہیں اور وہ مسلمانوں کو بھی اپنی طرح شہوات کا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔

642- **نزول شریعت کی ضرورت:** اس آیت میں وجہ بیان فرمائی کہ انسان چونکہ کمزور پیدا ہوا ہے اپنی ہدایت کی مخفی راہوں پر خود اطلاع نہیں پا سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ اپنے کلام کے یہ ہدایات اسے عطا فرمائی ہیں۔ گویا ان تینوں آیتوں میں تین اصولی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ یعنی

اوّل: نزول شریعت کوئی نئی بات نہیں پہلے لوگوں پر بھی شرائع نازل ہوتی رہیں۔

دوم: خدا کی طرف سے مقرر کردہ شریعت نہ ہوگی تو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کریں گے۔

سوم: نزول شریعت اس لیے ضروری ہے کہ انسان ہدایت کی راہوں کو اپنی کوشش سے پانے سے عاجز ہے۔

جتنی دیر میں ایک راہ کے غلط ہونے کا اس کو تجربہ ہوگا اتنی دیر میں ہی خود بوجہ اس غلط راہ پر چلنے کے ہلاک ہو جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود شرائع نازل کر کے انسان کے اس بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ چنانچہ اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بیان فرما دی ہے ﴿وَ خُلِقَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے مالوں کو آپس میں ناحق

الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ یعنی انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خود بخود اپنے لیے اپنے حقیقی فلاح کے رستے بنا سکے۔ بلکہ وہ ایک طاقتور ہستی کا محتاج ہے جس کو [آیت نمبر: 26] میں علیم حکیم کہہ کر یہ بتا دیا ہے کہ ان راستوں کا بتانا اسی کا کام ہوسکتا ہے جو ہر شے کا عالم اور ہر ایک حکمت پر آگاہ ہے۔ انسان کا علم اور انسان کی حکمت چونکہ بہت کمزور ہیں اس لیے اسے اللہ تعالیٰ کی امداد کی ضرورت ہے ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ کے یہ معنی نہیں کہ انسان شرائع پر عمل نہیں کرسکتا۔ بلکہ جیسا کہ ماقبل کی عبارت صاف بتاتی ہے یہ مطلب ہے کہ وہ شریعت کو خود اپنے لیے تجویز نہیں کرسکتا یہی وہ بوجھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر سے ہلکا کر دیا ہے۔ اس کو رستہ بتا کر اس پر چلنے کی ہدایت فرما دی ہے۔ باقی رہا شریعت کے بوجھ کے اٹھانے کی قابلیت یا ان راہوں پر جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں چلنے کی طاقت۔ سو اس کا ذکر دوسری جگہ فرمایا کہ خدا نے وہی راہیں انسان کو بتائی ہیں جن پر وہ چل بھی سکتا ہے جیسا کہ فرمایا ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: 286:2] اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے بڑھ کر مکلف نہیں کرتا۔

شرائط پر چلنے کی قابلیت اور عیسائی عقیدہ:

عیسائیوں کا یہ کہنا کہ انسان شریعت کے بوجھ کو اٹھا نہیں سکتا محض جھوٹ اور خدا پر ایک الزام ہے۔ کیونکہ اگر انسان واقعی اس قابل نہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے جن اپنی رضا کی راہوں کو اس پر بذریعہ شرائع کھولا ان پر وہ چل سکے۔ تو اس نے یہ عبث کام کیا کیوں کہ ہر زمانہ، ہر ملک میں، ہر قوم کے اندر نبی بھیجے۔ بلکہ بعض قوموں کے اندر جیسے بنی اسرائیل پے در پے نبی بھیجے اور ان انبیاء کے ذریعہ اپنی رضا کی راہیں انسانوں پر کھولیں۔ حالانکہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہ بالکل ایک لغو امر تھا اور پھر کیوں خدا کو دو ایک نبی بھیج کر یہ پتہ نہ لگ گیا کہ انسانوں پر اپنی رضا کی راہوں کا کھولنا ایک لغو امر ہے وہ ان پر چل ہی نہیں سکتے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نبی بھیجتا چلا گیا۔ اسلام کا عقیدہ اس کے بالمقابل کیسا صاف اور کیسا واقعات حقہ کے مطابق ہے۔ انسان ضعیف ہے، اس حد تک کہ وہ خود بخود خدا کی رضا کی راہوں کو نہیں پا سکتا۔ اس لیے ابتدائے دنیا سے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ہر قوم پر، ہر زمانہ میں، ہر ملک کے اندر اپنی رضا کی راہیں بتانے والے بھیجتا رہا۔ پس خود دنیا کے یہ واقعات کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کی راہیں بذریعہ شرائع کے ظاہر فرماتا رہا، اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ انسان میں یہ قابلیت ہے کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکے اور اگر اس میں یہ قابلیت ہی نہیں تو پھر کفارہ نے اس کی مشکل کو کس طرح حل کیا۔ اگر اس طرح حل کیا ہے کہ انسانوں کے اندر یہ قابلیت پیدا کر دی ہے کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکیں تو پھر بھی آخر خدا کو یہی کرنا پڑا کہ ان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل بنائے اور یہ پہلے ہی کیوں نہ کر دیا۔ کیوں بلا وجہ انسانوں کو اس قدر مصیبت میں ڈالا کہ ان پر تکلیف مالا یطاق ڈالی۔ حالانکہ قصور اپنا تھا کہ انسان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل ہی نہ بنایا تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ انسانوں کی قابلیت تو اب بھی وہی ہے مگر اب کوئی انسان اس کی راہوں پر چلے یا نہ چلے وہ سب کو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کفارہ کو مان لیں تو اباحت اور گناہ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ غرض صحیح اصول وہی ہے جو اسلام نے

بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾

کے ساتھ مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو[643] اور اپنے لوگوں کو قتل نہ کرو۔ بے شک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے۔[644]

بیان کیا ہے۔

643- ﴿لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ اس بات کو بیان کر کے کہ شرائع اور حقوق کا قائم کرنا ضروری تھا۔ اب نصیحت فرماتا ہے کہ جو جو حقوق کسی کے قائم کر دیئے گئے ہیں ان کے خلاف اب ایک دوسرے کا مال کھانے کی کوشش نہ کرو اور اَکْل سے مراد ہر قسم کا تصرف ہے اور باطل حق کا نقیض ہے اور حق طریق وہی ہے جس کو قرآن کریم نے بیان فرما دیا۔ مثلاً ورثہ کے ذریعے سے، ہبہ کے ذریعہ سے اور حقوق جو ایک دوسرے پر قائم کیے گئے ہیں ان کے ذریعے سے تو حق طریق ہیں ان کے سوائے جو طریق ہوگا وہ باطل ہوگا۔ یہی حکم [البقرة: 188] میں بھی آچکا ہے۔ یہاں عورتوں اور یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس کو دہرایا ہے۔ منسوخی کے شائقین نے اس آیت کو بھی منسوخ کہہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ سورہ نور کی وہ آیت جس کی رو سے باپوں، بھائیوں، چچوں، دوستوں کے گھروں سے کھانا جائز ہے وہ اس کی ناسخ ہے۔ گویا یہ بالباطل کھانا ہوا۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ یہاں اِلَّآ استثنائے منقطع ہے۔ تراضی دونوں کا ایک دوسرے سے اظہار رضامندی ہے۔ **تجارت کا ذکر** بوجہ اس کی عظمت کے یہاں خصوصیت سے کیا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے [تِسْعَةُ أَعْشَارِ الرِّزْقِ فِي التِّجَارَةِ] (كنز العمال: جلد4، صفحہ30، حديث:9342) (ر) رزق کے دس حصوں میں سے نو تجارت میں ہیں اور ایک حدیث میں ہے: [أَطْيَبَ الْكَسْبِ كَسْبُ التُّجَّارِ] (شعب الإيمان: جلد6، صفحہ488، حديث: 4513) ''بہترین کمائی تجارت کی کمائی ہے۔''

644- ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ اپنے لوگوں کو قتل مت کرو۔ گویا ایک طرف اگر ایک دوسرے کے حقوق مالی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ناحق ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ۔ تو دوسری طرف حقوق حفظ جان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو قتل مت کرو اور اَنْفُسَكُمْ کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ سب مسلمان گویا ایک ہی نفس کے حکم میں ہیں۔ دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو قتل مت کرو اور اس صورت میں یا تو یہ مراد ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کرنا یا یتیموں، بیواؤں کے حقوق نہ دینا درحقیقت اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو ہی قتل کرنا ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے یہاں قتل نفس سے مراد اپنے آپ کو ان باتوں سے محروم رکھنا لیا ہے جن سے حیاتِ ابدی ملتی ہے کیونکہ اس کے آگے آتا ہے ﴿وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا﴾ اور یا یہ مراد ہو سکتی ہے کہ **خودکشی مت کرو**۔ کیونکہ بہت سے جاہل جب ان کو غم یا خوف یا سخت بیماری یا کوئی ذلت پہنچتی ہے تو اس کو ناقابل برداشت سمجھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ اسلام نے خودکشی کو سخت جرم ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ خودکشی کرنے والا انسان درحقیقت تکلیف کے سامنے ہمت ہار دیتا ہے۔ اور جو تکلیف سے گھبرا کر ہمت ہار دے اس

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

اور جو شخص حد سے نکل کر اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اسے آگ میں داخل کریں گے۔ اور یہ اللہ پر آسان ہے۔(645)

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ

اگر تم ان بڑی بدیوں سے بچتے رہو جن سے تم کو روکا جاتا ہے(646)

کا ایمان خدا پر نہیں۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ خودکشی کرنے والا جہنمی ہے۔ (ث) بلکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ خیبر کی جنگ میں ایک شخص کے متعلق جو اسلام پر تھا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ اہل نار میں سے ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ اس دن اس نے خوب جنگ کی اور آخر زخمی ہوا۔ لیکن زخموں کی تکلیف کو برداشت نہ کر کے خودکشی کر لی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے شدت کی سردی میں حالت جنب میں ایک جنگ میں بغیر غسل کرنے کے تیمم کر کے نماز پڑھا دی۔ چنانچہ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ رات سخت سردی تھی اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ اس لیے میں نے غسل نہیں کیا۔ تو نبی کریم ﷺ ہنس پڑے۔

شریعت کے احکام میں سب سے زیادہ وقعت اس بات کو دی ہے کہ ایک دوسرے کے مال باطل طور پر نہ کھائیں۔ درحقیقت دنیا میں اکثر بدیاں باطل طور پر مال کھانے سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ مال کی محبت اور اس کی حرص ہی انسان سے اور قوموں سے اکثر ظلم کراتی ہے۔ اور قتل نفس کو اکل مال بالباطل کے بعد اس لیے رکھا کہ قتل کے واقعات بھی بہت سے مال کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ کی اس خطرناک جنگ کا موجب بھی جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں یہی لالچ تھا۔

645- آگ میں جلانا یا داخل کرنا اللہ پر آسان ہے۔ یہ اس لیے کہا کہ لوگ اس کو بڑا بعید سمجھتے تھے بلکہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہاں ہوگا۔ فرماتا ہے اس میں استبعاد یا محال کوئی نہیں۔

646- تَجْتَنِبُوْا۔ جَنَبَ سے ہے جس کے اصل معنی پہلو ہیں اور اجتناب کے معنی کسی چیز سے ایک پہلو میں ہو جانا ہیں یعنی اس سے بچ جانا۔

كَبَآىِٕرَ۔ كَبِيْرَةٌ کی جمع ہے جس کے اصل معنی صرف بڑا ہیں۔ اور کبیرۃ ہر اس گناہ کے معنی میں آتا ہے جس کی عقوبت بڑی ہو۔ (غ) اور ابن اثیر میں ہے کہ کبیرہ وہ فعل قبیح ہے جس سے شریعت نے روکا ہو اور اس کا امر عظیم ہو۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ ہے ﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ [النجم: 32:53] ''وہ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں سوائے اس کے کہ خیال دل میں گزرے۔'' **کبیرہ خاص خاص گناہوں کا نام ہے یا نہیں** اس میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض احادیث کی بنا پر چند خاص گناہوں کو کبیرہ کہا جاتا ہے مثلاً صحیحین میں حدیث ہے: [اجْتَنِبُوا السَّبْعَ

الْمُوبِقَاتِ] (صحيح البخاری، كتاب الوصايا، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى (إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا): 2766) ''سات ہلاک کر دینے والوں سے بچو۔'' اور وہ سات گناہ یہ ہیں۔ شرک، سحر، قتل، مال یتیم کھانا، سود کھانا، جنگ کے دن پیٹھ پھیر دینا، پاکدامن مومن عورتوں پر الزام لگانا۔ اور دوسری حدیث میں بجائے سحر کے ہے [اَلْاِنْقِلَابُ إِلَى الْأَعْرَابِ بَعْدَ الْهِجْرَةِ] ''ہجرت کے بعد بادیہ نشینی کی طرف لوٹ جانا۔'' ایک اور میں بجائے اس کے والدین کی نافرمانی کہا ہے اور صحیحین کی ایک حدیث میں صرف تین کو کبیرہ (یا اکبر الکبائر) کہا ہے۔ شرک، والدین کی نافرمانی، جھوٹی گواہی دینا اور ایک صحیحین کی حدیث میں ہی [أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب قَوْلُهُ تَعَالَى (فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ): 4477) کا جواب نبی کریم ﷺ سے یوں مروی ہے۔ اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ دریافت کیا گیا اس کے بعد فرمایا: قتل اولاد۔ اس خوف سے کہ اس کو کھانا دینا پڑے گا۔ دریافت کیا گیا اس کے بعد؟ فرمایا: ہمسایہ کی جورو سے زنا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللهِ إِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ﴾ [الفرقان: 68:25] ''اور وہ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے قتل نہیں کرتے سوائے اس کہ انصاف چاہے اور نہ زنا کرتے ہیں۔'' اور ایک حدیث میں ہے کہ شراب کے متعلق نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اکبر الکبائر ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ یہ بھی کبائر میں سے ہے کہ ایک شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ اور اس کی کیفیت یوں بیان فرمائی کہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے تو وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے گا۔ اور یہ بخاری کی حدیث ہے اور بخاری ہی میں ہے [سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ] (صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لاَ يَشْعُرُ: 48) اور ظاہر ہے کہ فسوق بھی کبائر میں سے ہے اور ترک صلوٰۃ کو بھی کفر کہا ہے۔ چنانچہ سنن میں ہے [مَنْ تَرَكَ صَلَاةً فَقَدْ كَفَرَ] اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اکبر الکبائر میں سے ہے۔

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبائر کو معین نہیں فرمایا اور الگ الگ موقعوں پر الگ الگ جواب دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسا سائل کی حالت کا اقتضا تھا اس کے مطابق اس کو جواب دیا ہے۔ پس احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کبیرہ معین گناہوں کا نام نہیں۔ چنانچہ یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔ ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے کہا تھا کہ کبیرہ سات ہیں تو آپ نے فرمایا وہ ستر سے زیادہ قریب ہیں اور دوسری روایت میں ہے سات سو سے زیادہ قریب ہیں اور ایک روایت میں آپ نے کبیرہ کے معنی یوں کیے ہیں [كُلُّ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ فَهُوَ كَبِيْرَةٌ] (شعب الايمان، جلد1، صفحہ462، حدیث:288) ''جس چیز سے اللہ نے روکا ہے وہ کبیرہ ہے۔'' اور دوسری روایت میں ہے [كُلُّ مَا عُصِيَ اللهُ تَعَالٰى فِيْهِ فَهُوَ كَبِيْرَةٌ] (شعب الايمان، جلد1، صفحہ463، حدیث:289) ''ہر ایک چیز جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے وہ کبیرہ ہے۔'' اگر عظمت یا کبر کے لفظ کو مدنظر رکھا جائے تو قرآن کریم میں ایک طرف شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ دوسرے موقعہ پر قتل اولاد کے متعلق فرمایا: ﴿إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا﴾ [بنی إسرائيل: 31:17] ''ان کا مار ڈالنا بڑی غلطی ہے۔'' تیسرے موقعہ پر جوئے اور شراب کے متعلق فرمایا: ﴿فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ﴾ [البقرة: 219:2] ''ان دونوں میں بڑی برائی

نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

تو ہم تمہاری برائیاں تم سے دور کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ میں داخل کریں گے۔ (647)

ہے۔'' اور عیسائیوں کے عقیدہ اتخاذ ولد کے متعلق فرمایا: ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ [الكهف: 5:18] ''بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے۔'' ایک جگہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کے متعلق فرمایا: ﴿قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ﴾ [البقرة: 217:2] ''کہہ دے اس میں جنگ کرنی بہت بری ہے۔'' اور اس سے بڑھ کر کفر باللہ اور مسجد الحرام کا کفر اور اس کے اہل کا اخراج قرار دیا ﴿وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۫ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [البقرة: 217:2] ''اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے لوگوں کا اس سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی برا ہے۔'' اور اگر قتل کو کبیر کہا تو مسلمانوں کو اذیت دینا اس سے بھی بڑھ کر فرمایا: ﴿وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ [البقرة: 217:2] ''اور فتنہ قتل سے بڑھ کر برا ہے۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کبیر یا اکبر الکبائر خاص قسم کے گناہوں کو نہیں کہا اور جس طرح کبائر سے چند خاص گناہ مراد نہیں اس کے مقابلہ پر جو صغائر کہلاتے ہیں ان سے بھی خاص گناہ مراد نہیں۔ یوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر ایک گناہ یکساں نہیں۔ جیسا جیسا جس جس گناہ کا اثر ہے اسی لحاظ سے اس کو بڑا یا چھوٹا کہا جائے گا۔ مگر چھوٹے گناہوں پر اصرار بھی گناہ کو بڑا بنا دیتا ہے اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے [لَا كَبِيرَةَ بِكَبِيرَةٍ مَعَ الِاسْتِغْفَارِ، وَلَا صَغِيرَةَ بِصَغِيرَةٍ مَعَ الْإِصْرَارِ] (شعب الإيمان: جلد9، صفحہ406، حديث: 6882) ''استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ نہیں اور جس پر اصرار ہو وہ صغیرہ نہیں رہتا۔''

647- مُدْخَلًا۔ یا مصدر ہے بمعنی اِدْخَالٌ اور یا اَدْخَلَ یُدْخِلُ سے ظرف مکان ہے۔

كَرِيْمٌ۔ کَرَمٌ جب اللہ تعالیٰ کے وصف میں ہو تو اس کا احسان و انعام مراد ہوتا ہے اور جب انسان کے وصف میں ہو تو اخلاق اور افعال محمودہ پر استعمال ہوتا ہے جو اس سے ظاہر ہوں اور اس کا استعمال صرف محاسن کبیرہ پر ہوتا ہے اور ہر ایک چیز جو اپنی نوع میں معزز و ممتاز ہو وہ کریم کہلاتی ہے۔ (غ) ﴿كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾ [الشعرآء: 7:26] ''اس میں ہم نے کتنے ہر قسم کے عمدہ جوڑے اگائے ہیں۔'' ﴿وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ﴾ [الدخان: 26:44] ''اور کھیتیاں اور عزت والے مقام'' ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ [الواقعة: 77:56] ''یقینا یہ قرآن نفع پہنچانے والا ہے۔'' ﴿وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ [بنی إسرائيل: 23:17] ''اور ان دونوں سے ادب سے بات کر۔''

اس آیت میں ایک پر حکمت فلسفہ بدی سے بچنے کا پایا جاتا ہے۔ بدی کسی ایک چیز کا نام نہیں ہر شے کا نیک و بد استعمال ہو سکتا ہے اور ہر انسان کی زندگی میں الگ الگ موقعے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ نیکی یا بدی کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی مذہب تمام بدیوں کو گننے لگتا اور اپنے پیروؤں کو یہ کہتا ہے۔۔۔۔ اب تم ان باتوں سے بچو تو وہ ایک نہایت ہی ناکام کوشش ہوتی۔ قرآن کریم نے یہ پر حکمت طریق اختیار کیا ہے کہ چند موٹی موٹی بدیوں سے جن کو ہر انسان جانتا ہے روک کر یہ فرمایا کہ اگر تم

وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ

اور اس کی آرزو نہ کرو جس سے اللہ نے تم کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کا حصہ ہے جو وہ

ان سے بچو تو ہم تمہاری بدیاں دور کر دیں گے۔ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکمت کیا ہے یہ تو ایک فرضی بات ہے کہ بڑی بڑی بدیوں سے بچ جاؤ گے تو ساری بدیاں دور کر دیں گے۔ مگر ایسا اعتراض وہی کرے گا جس نے بدی کے فلسفہ پر غور نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ بدی جس قدر زیادہ بین ہوگی یا جس قدر بڑی ہوگی اسی قدر انسان اس کا آسانی سے مقابلہ کر سکے گا۔ جو شخص فطرت انسانی پر غور نہیں کرتا وہ اسے مستبعد خیال کرے گا، مگر فطرت انسانی ایسی ہی ہے کہ جس چیز کا نقصان بہت بین ہوتا ہے، اس سے بچنا انسان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ فطرت کے اندر جو خالق فطرت نے طاقتیں ودیعت کر رکھی ہیں وہ ایک کھلے نقصان کو دیکھ کر مقابلہ کے لیے باہر نکل کھڑی ہوتی ہیں اور انسان کا بدی پر غالب آنا یہی ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کے لیے باہر نکل آئیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس چیز کا نقصان بہت بین ہوگا وہی بڑی بدی کہلائے گی۔ پس اصل یوں ہے کہ بڑی بدی کا نقصان بہت کھلا ہوتا ہے اور کھلے نقصان کو دیکھ کر انسان کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کے لیے نکل آتی ہیں۔ اور جب نیکی کی طاقتیں مقابلہ کے لیے نکل آئیں تو گو اگر فطرت بدی کے نیچے دبی ہوتی ہے تو ابتدا میں وہ کمزور ہونے کی وجہ سے دب بھی جائیں گی مگر آخر مقابلہ کرتے کرتے ان میں طاقت آجائے گی۔ جس طرح بچہ جب کھڑا ہونے لگتا ہے یا چلنے لگتا ہے تو پہلے پہلے گرتا ہے مگر اس کی بار بار کی کوشش اس کی طاقت کو مضبوط کر دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کی روحانی طاقتیں مقابلہ کے وقت نشوونما پاتی ہیں۔ پس جب ایک شخص بڑی بدیوں کا مقابلہ کرنے کا اپنے آپ کو عادی بنائے گا تو اس کی نیکی کی اندرونی قوتیں نشوونما پائیں گی اور ان قویٰ کے نشوونما کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان چھوٹی بدیوں سے بھی بچ جائے گا جن کے نتائج ایسے بین نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر سے آہستہ آہستہ بدی کا میلان ہی دور ہو جائے گا اور اس کی بدی کی طاقتیں بالکل مر جائیں گی اور یہی وہ مقام ہے جس پر اسلام پہنچانا چاہتا ہے ﴿نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ سے مراد یہاں بدی کی طاقتوں کا دور کر دینا ہی ہے کیونکہ جب انسان سے بدی سرزد نہ ہوگی تو گویا اس کی بدیاں اس سے دور ہو جائیں گی۔

بدی کا کفارہ اسلام اور دیگر مذاہب میں:

یہ وہ راہ ہے جس کو بدی کے کفارہ کے طور پر اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس کے بالمقابل کسی مذہب کا کفارہ لے لیا جائے وہ محض ایک طفلانہ خیال معلوم ہوتا ہے مثلاً عیسائیوں کا کفارہ ہی لے لو کہ ایک شخص کے (یا خدا کے) مصلوب ہو جانے پر ایمان لانے سے انسان بدیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ لیکن آج تک کوئی عیسائی یہ نہیں بتا سکتا کہ کس طرح اس بات کو مان لینے سے کہ یسوع مسیح صلیب پر مر گئے تھے ایک انسان کی بدی کی قوت کمزور ہو جاتی ہے یا وہ بدی سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہندوؤں کا عقیدۂ تناسخ ہے۔ اگر کوئی شخص بیل یا کتے یا گدھے یا کیڑے مکوڑوں کی جون میں چلا جاتا ہے تو اس سے وہ گناہوں سے کیونکر پاک ہو جاتا ہے؛ بالخصوص اس صورت میں جبکہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ فلاں جون اس کو کس بدی کی سزا میں ملی

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

کمائیں، اور عورتوں کا حصہ جو وہ کمائیں۔ اور اللہ سے اس کا فضل مانگتے رہو۔ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (648)

ہے تا کہ وہ آئندہ ہی اس سے رکے۔ غرض اسلام کی پر حکمت تعلیم کے سامنے واقعی یہ طفلانہ خیالات ہیں۔

648- تَتَمَنَّوْا۔ تَمَنّٰی کا مادہ مَنَیٌ ہے جس کے اصل معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں۔ اور تمنی کے معنی ہیں کسی چیز کا صرف دل کے اندر اندازہ کرتے رہنا اور دل کے اندر اس کی تصویر بناتے رہنا۔ اور اکثر تمنی یہی ہے کہ جس چیز کی حقیقت نہ ہو اس کا تصور کرتے رہنا۔ (غ)

جب یہ حکم دیا کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریق پر نہ کھاؤ تو ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا کہ جو فضیلت تم میں سے ایک کو دوسرے پر ملی ہے اس کا باطل تصور بھی نہ کیا کرو۔ ایک دوسرے کے مال کو باطل طریق پر کھانا ایک ظاہر فعل ہے جس کا علاج برنگ سزا ظاہری حکومت بھی کرتی ہے اور ایک دوسرے کی فضیلت پر آرزوئے باطل کرنا ایک باطنی فعل ہے جس کا علاج صرف مذہب کر سکتا ہے اور ظاہر کا علاج بہ نسبت باطن کے آسان بھی ہے اس لیے پہلے ظاہری فعل کی طرف توجہ دلائی تو پھر باطنی فعل کی طرف۔

تمنی سے روکنے کا مطلب:

ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو چیز دوسرے کے قبضہ میں ہے مال یا جاہ اس کی آرزو مت کرو کہ وہ ہمارے پاس ہو اس کے پاس نہ ہو۔ لیکن یہ چاہنا کہ جیسی چیز دوسرے کے پاس ہے ویسی ہی ہم کو مل جائے، یہ رشک ہے حسد نہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ تمنی صرف دل میں تصور کرنے کا نام ہے اور جس فضیلت کا یہاں ذکر ہے اس سے وہ امور مراد ہیں جو انسان خود بطور کسب نہیں لیتا بلکہ وہ وہبی امور ہیں یا ایسے حالات ہیں جن میں قدرت نے انسان کو رکھ دیا ہے۔ مثلاً کسی کو مرد بنایا، کسی کو عورت، کسی کو قوی بنایا، کسی کو ضعیف، کسی کو امرا کے گھر میں پیدا کر دیا، کسی کو غربا کے گھر میں، کسی کو قوائے دماغی اعلیٰ درجہ کے دے دیئے، کسی کو کم دے دیئے۔ اور تمنی کے بالمقابل اکتساب کو لا کر اسے واضح بھی کر دیا۔ ایسی آرزوئیں کرتے رہنا کہ میں امیروں کے گھر کیوں پیدا نہ ہوا۔ یا میں فلاں حالات میں کیوں پیدا نہ ہوا۔ یا میرے گرد و پیش یہ امور کیوں نہ ہوئے۔ یہ سب باطل آرزوئیں ہیں۔ اس لیے اول یہ حکم دیا کہ ایسی آرزوئیں مت کیا کرو۔ پھر اس کے بعد اصول بتایا کہ جن حالات میں انسان پیدا ہوا ہے انہی حالات میں اس کو کام کرتے رہنا چاہیے اور جس قدر طاقت اسے دی گئی ہے اسے خرچ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کو عام فہم رنگ میں یوں بیان کر دیا کہ مرد جو کچھ کمائیں گے اس سے بہرہ ور ہوں گے، عورتیں جو کچھ کمائیں گی اس سے بہرہ ور ہوں گی۔ کیونکہ سب سے بڑی تقسیم مرد و عورت کی ہے۔ مرد الگ حالت میں رکھا گیا ہے اور وہ اپنے کمال کو اور طریق پر حاصل کرتا ہے۔ عورت اور حالات میں رکھی گئی ہے اور وہ اپنے کمالات کو اور طریق پر حاصل کرتی ہے جیسا کہ دوسری

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ ع 5 8 2

اور سب کے لیے ہم نے وارث بنائے اس میں سے جو والدین اور قریبی چھوڑیں۔ اور جن سے تمہارے داہنے ہاتھوں نے (عہد) باندھے ہیں تو ان کو ان کا حصہ دو۔ اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ (649)

جگہ ہے ﴿وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰۤى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾﴾ [اللیل: 92:3-4] ''اور نر اور مادہ کا پیدا کرنا۔ بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔'' مگر باوجود علیحدہ علیحدہ حالات میں رکھے جانے کے دونوں کے لیے اکتساب کی راہ کھلی ہے دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔ عورتیں دینی ترقیات اسی طرح حاصل کرسکتی ہیں جس طرح وہ دنیوی ترقیات حاصل کرسکتی ہیں۔ جن کے لیے اسلام نے ﴿لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ کہہ کر ہمیشہ کے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب عورتوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کیا کہ مرد تو ہم پر بہت سبقت لے گئے کہ ان کو جہاد کا موقعہ ہے اور وہ بہت ثواب حاصل کرسکتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرسکتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا [إِنَّ لِلْحَامِلِ مِنْكُمْ أَجْرُ الصَّائِمِ الْقَائِمِ، وَإِذَا ضَرَبَهَا الْطَلَقَ لَمْ يَعْلَمْ أَحَدٌ مَا لَهَا مِنَ الْأَجْرِ، فَإِنْ أَرْضَعَتْ كَانَ لَهَا بِكُلِّ مَصَّةٍ أَجْرُ إِحْيَاءِ نَفْسٍ] (غق) یعنی تم میں سے حاملہ عورت کے لیے اس شخص کا اجر ہے جو دن کو روزے رکھتا ہے اور رات کو ذکر الٰہی میں کھڑا رہتا ہے۔ پھر جب وہ جنتی ہے تو کوئی نہیں جانتا کہ اس کے لیے کس قدر اجر ہے۔ پھر اگر وہ دودھ پلاتی ہے تو ہر ایک مرتبہ جو بچہ اس کا دودھ چوستا ہے اس کو ایک نفس کے احیاء کا اجر ملتا ہے۔

﴿لَا تَتَمَنَّوْا﴾ میں یہ سبق بھی دیا ہے کہ انسان کو ان حالات پر راضی رہنا چاہیے جن میں اس کو پیدا کیا گیا ہے اور جن سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونا ہے اور یہی قیام فی ما اقام اللہ ہے اور **رضا بالقضاء** کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک ذلت اور دُنو کی حالت سے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔

649- مَوَالِيَ۔ مَوْلٰی کی جمع ہے جو ولی سے ہے اور ولاء بمعنی قرب بھی استعمال ہوا ہے۔ خواہ وہ قرب کسی لحاظ سے ہو۔ اس لیے وہ شخص جو غلام کو آزاد کرے، وہ غلام جو آزاد کیا جائے۔ حلیف یعنی جس سے معاہدہ ہو۔ ابن العم۔ وارث یعنی عصبۃ ان سب پر مولیٰ کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔ یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔

﴿عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ عقد کے اصل معنی ہیں کسی چیز کی اطراف کو اکٹھا کر دینا۔ مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے۔ مثلاً عقد بیع، عقد عہد وغیرہ اور اَیْمَانٌ سے مراد یا داہنے ہاتھ ہیں۔ کیونکہ عہد میں ہاتھ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے اور یا مراد قسمیں ہیں۔ اور عَقَدَتْ کا مفعول محذوف ہے یعنی عُهُوْدُهُمْ۔ پس معنی یوں ہوئے جن لوگوں سے تمہارے داہنے ہاتھوں نے عہد باندھا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں
فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لیے کہ انہوں نے

مال کے حصول کے دوسرے جائز ذرائع:

جب یہ فرمایا کہ انسان بذریعہ اکتساب ہی کچھ حاصل کرتا ہے تو دوسرے حصول کے ذریعوں کی طرف بھی توجہ دلائی اول یہ کہ ''ہر ایک کے لیے ہم نے وارث بنائے ہیں جو اس کے ترکہ کو لیتے ہیں اور وہ وراث ماں، باپ یا قریبی ہیں۔'' ورثہ کے علاوہ ایک حق بذریعہ معاہدات پیدا ہوتا ہے یعنی جس سے تم عہد کرو اس کا بھی حق ہو جاتا ہے اس میں خاوند کا بی بی سے عہد بھی شامل ہے۔ مگر یہاں خصوصیت سے میاں بی بی کا عہد ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آگے ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ [34] میں صاف بھی کر دیا ہے۔

معاہدہ یا مؤاخاۃ کے ذریعہ سے ورثہ کی منسوخی:

﴿وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ﴾ کو بعض لوگوں نے منسوخ کہا ہے اور اس کے تین طرح پر معنی کیے ہیں۔

1. اول یہ کہ اس سے مراد وہ حلیف ہیں جو ایام جاہلیت میں لوگ بنالیا کرتے تھے یعنی وہ ایک دوسرے سے معاہدہ کر لیا کرتے تھے کہ میرا خون تیرا خون ہے۔ میری صلح تیری صلح ہے۔ میری جنگ تیری جنگ ہے۔ تو میرا وارث ہوگا میں تیرا وارث ہوں گا۔ ایسے حلیف کو متوفی کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ملا کرتا تھا اور اس آیت میں گویا اسی کو جائز رکھا ہے۔
2. دوسرے یہ کہ اس سے مراد منہ بولے بیٹے ہیں جن کو متبنّٰی کہا جاتا ہے۔
3. تیسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی تھی اور یہ مواخاۃ ایک کو دوسرے کا وارث بنا دیتی تھی۔

اور پھر اس آیت میں اس قسم کے ورثہ کو جائز رکھ کر اس کو دوسری آیت ﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [الأنفال: 75:8] ''اور رشتہ کے تعلقات والے اللہ کے حکم میں آپس میں زیادہ حق دار ہیں۔'' سے منسوخ قرار دیا ہے حالانکہ سورۃ الانفال پہلے کی نازل شدہ ہے۔ اور بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''اس آیت ﴿وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ﴾ میں موالی سے مراد وارث ہیں ﴿وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ کے متعلق یہ ہے کہ جب مہاجر مدینہ میں آئے، مہاجر انصاری کا وارث ہوتا تھا اس کے ذی رحم کو چھوڑ کر بسبب اس اخوت کے جو نبی کریم ﷺ نے ان کے درمیان قائم کر دی تھی۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ﴾ تو یہ بات منسوخ ہوگئی۔ پھر کہا ﴿وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ ان کے لیے نصرت اور مہربانی اور نصیحت ہے اور میراث باقی نہیں رہی۔ ہاں اس کے حق میں وصیت ہو سکتی ہے۔'' پس جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ کہا ہے ان کو غلطی یہ لگی ہے کہ انہوں نے سمجھا کہ پہلے مواخاۃ والے کچھ ورثہ پاتے تھے تو وہ قرآن کریم کے اس حکم کے ماتحت پاتے تھے۔ حالانکہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوا کہ وہ کسی پرانے رواج کے ماتحت ورثہ لے لیتے تھے اور خود اس

اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے۔(650) سو نیک عورتیں

آیت نے اس کو منسوخ کر دیا۔ ہاں یہ جائز رہا کہ بذریعہ وصیت ان کو کچھ دے دیا جائے۔

650- قَوّٰمِیْنَ۔ قَوَّامٌ کی جمع ہے جو قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے [قَامَ الرَّجُلُ عَلَى الْمَرْأَةِ] کے معنی ہیں مَأْنَهَا یعنی اس کی مؤنت یا روزی مہیا کی اور قَوَّامٌ عَلَيْهَا کے معنی ہیں مَائِنٌ لَهَا معنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اور ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کے معنی ہیں [مُتَكَفِّلُوْنَ بِاُمُوْرِ النِّسَاءِ مَعْنِيُّوْنَ بِشُؤْنِهِنَّ] یعنی ''عورتوں کے امور کے متکفل ان کے حالات پر توجہ کرنے والے۔'' (ل) اور تاج العروس میں ہے کہ [قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ] اور [قَامَ عَلَيْهَا] کے معنی ہیں [مَانَهَا وَقَامَ بِشَأْنِهَا مُتَكَفِّلًا بِأَمْرِهَا] یعنی اس کی مؤنت یا روزی مہیا کی اور اس کے امر کا تکفل کرتے ہوئے اس کی حالت کو قائم کیا اور [قَوَّامٌ لَهَا] کے معنی [مَائِنٌ لَهَا] دیئے ہیں یعنی اس کے لیے روزی مہیا کرنے والا اور اس کے امر کا متکفل۔ پس قوام کے اصل معنی متکفل ہیں اس کے معنی محض محافظ یا محض حاکم درست نہیں اور تَكَفَّلَ میں روزی کا مہیا کرنا حفاظت کرنا اور تادیب سب امور شامل ہیں۔ کیونکہ جو شخص جس کا متکفل ہوتا ہے اس کی جسمانی اور اخلاقی حفاظت بھی اس کے ذمہ ہوتی ہے۔

مردوں کے عورتوں پر قوام ہونے سے مراد:

عورتوں کے ذکر کے ساتھ مردوں کے حقوق کا بھی ذکر ضروری تھا اس لیے بتایا کہ مرد عورتوں کے قوام یعنی متکفل ہیں۔ گھر بمنزلہ ایک چھوٹی سی بادشاہت کے ہے حدیث میں ہے [كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ] (صحيح البخاری، كتاب الجمعة، باب الْجُمُعَةِ فِي الْقُرَى وَالْمُدُنِ: 893) ''تم میں سے ہر ایک بادشاہ ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔'' اور اس کی تفصیل میں یہ بھی فرمایا کہ مرد بھی ایک بادشاہ ہے اور اس کے گھر کے لوگ بمنزلہ ایک رعیت کے ہیں اور عورت بھی اپنے خاوند کے مال کو صرف کرنے میں بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا ہوں گی وہاں ایک شخص کو رنگ حکومت بھی دینا پڑے گا۔ اسلام ایک عملی مذہب ہے اور جس مضمون کو قرآن شریف لیتا ہے ایک کامل حکیم کی طرح اس کے سارے پہلوؤں پر بحث کرتا ہے اس قدر باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا کرنے کے بعد یہ ضرور تھا کہ گھر کی چھوٹی سی سلطنت میں ایک کو دوسرے پر کچھ رنگ حکومت بھی دیا جاتا اور عملاً ساری دنیا کو دینا پڑا ہے کیونکہ اس کے بغیر نظم قائم نہیں رہ سکتا۔ اس رنگ حکومت کو صراحت سے حکومت نہیں کہا اس لیے کہ خود دوسری جگہ فرما چکا ہے: ﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرة: 228:2] جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ اور گھر کے نظم میں مرد و عورت کا اشتراک ہے۔ تاہم ان کے حقوق اور ذمہ داریاں الگ الگ قسم کی ہیں۔ پس ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر فرمایا کہ آخری ذمہ داری مردوں کی ہے اور وہ رنگ حکومت جس سے گھر کے امور طے ہوں مرد کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ خود ہی بیان فرمائی ہے:

1. اول وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ چنانچہ مردوں کو عورتوں پر قوائے جسمانی میں فضیلت

قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ فرمانبردار پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں اس کی وجہ سے جو اللہ نے (ان کی) حفاظت کی ہے (651)

ہے۔ اس لیے روزی کمانے کا کام اور ملک وقوم کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا اور جو ملک کا محافظ ہے وہی گھر کا محافظ بھی ہوسکتا ہے۔ مگر ﴿بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ کہہ کر یہ بھی اشارہ کر دیا کہ بعض معاملات میں عورتوں کو بھی فضیلت ہے مثلاً یہ کہ وہ ایک رنگ میں مردوں کی مخدوم ہوگئیں۔ کیونکہ روزی کا مہیا کرنا، گھر کی حفاظت کرنا، یہ ایک خدمت ہے۔

❷ اور دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ مرد عورتوں پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور یہ وجہ اسی حکومت کے رنگ کے لیے بطور دلیل ہے جو تکفل کے مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ یعنی مرد کو عورت پر اختیار اس لیے دیا گیا ہے کہ اس پر بوجھ بھی زیادہ ڈالا گیا ہے۔ کیونکہ وہ مال کمانے والا اور وہ مال کو خرچ کرنے والی ہے اور مال کے کمانے والے کو بہر حال اس کے خرچ کرنے والے پر اختیارات ہونے چاہئیں۔ اگر اس کے خلاف ہوگا تو موجب نقصان ہوگا۔ یہی معنی اس حدیث کے معلوم ہوتے ہیں [لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً] (صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب كِتَابِ النَّبِيِّ ﷺ إِلَى كِسْرَى وَقَيْصَرَ: 4425) ''وہ قوم کامیاب نہیں ہوسکتی جو اپنے امر کا اختیار عورت کو دے دیں۔'' یعنی کمانے والے کا اختیار نہ ہو بلکہ خرچ کرنے والوں کا ہو۔ یوں اس حدیث میں جمہوریت کا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول بیان کر دیا ہے۔ اور یہ نظم کیسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ مرد کمائے اور عورت خرچ کرے اور مرد اس کا نگران ہو، اور یہی اصول جمہوریت ہے کہ عوام جن کے اموال نظم ملکی پر خرچ ہوتے ہیں حکام ان پر نگران ہوں۔

651- قٰنِتٰتٌ۔ قُنُوْتٌ کے معنی چونکہ خضوع کے ساتھ فرمانبرداری کا لازم کر لینا ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر ہی بولا گیا ہے۔

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ﴾ حفاظت کا مفعول مقدر ہے یعنی حقوق خاوند اور لِلْغَيْبِ سے مراد ہے فِيْ غَيْبَتِهٖ یعنی اس کی پیٹھ کے پیچھے اس بات کا ذکر کرنے کے بعد کہ مرد عورتوں کے متکفل ہیں۔ اب دو قسم کی عورتوں کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے صالحات یعنی اچھی عورتوں کا ذکر کیا ہے اور اس میں دو امور کے ذکر پر بس کی ہے۔ اول یہ کہ وہ قانتات ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والی ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ خاوند کے حقوق کی پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والی ہوں۔ خاوند کے حقوق کا بلحاظ ان کی عظمت کے ذکر کیا۔ گویا خدا کی فرمانبرداری کے بعد ان پر خاوند کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اور لِلْغَيْبِ یا پیٹھ پیچھے کی شرط اس لیے لگائی کہ قرآن کریم کمال کی حالت کا بیان کر دیتا ہے جو عورت پیٹھ پیچھے خاوند کے حقوق کی نگہداشت کرتی ہے وہ اس کے سامنے تو ضرور ہی کرے گی۔ ان میں سب سے بڑی بات خاوند کا حق زوجیت ہے۔ گویا عورت کی عفت کو اس کا سب سے بڑا جوہر قرار دیا ہے۔ مگر خاوند کے اور بھی حقوق عورت پر ہیں۔ مثلاً اس کی پردہ کی باتوں کو ظاہر نہ کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے، اس میں کسی قسم کا ناجائز تصرف نہ کرے، اس میں فضول خرچی نہ کرے، ضرورت اور ذرائع آمد سے زیادہ خرچ نہ

وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ

اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں ڈر ہو(652) تو ان کو وعظ کرو اور خوابگاہوں میں ان کو الگ کر دو اور ان کو مارو پھر

کرے۔ بیہقی میں ایک حدیث بھی ہے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا[اِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِي مَالِهَا وَنَفْسِهَا] (کنز العمال:جلد16، صفحہ282، حدیث: 44477) ''جب تم اس سے غائب ہو تو تمہارے مال میں اور اپنے نفس میں تمہاری حفاظت کرے۔''

﴿بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یا تو ما موصولہ ہے اور عائد محذوف ہے یعنی بمقابلہ ان حقوق کے جن کو اللہ نے ان کے لیے محفوظ کر دیا ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق کو مردوں سے لے کر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور ان میں خود یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے حقوق لیتیں۔ اس لیے اب اس قدر حقوق لینے کے بعد ان پر یہ حق ہو گیا ہے کہ وہ بھی خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کریں اور یہی معنی قابل ترجیح ہیں۔ مگر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ عورتیں جو خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں تو وہ اللہ کی حفاظت سے ہی ایسا کرتی ہیں۔

652- تَخَافُوْنَ۔ خَوْفٌ کے معنی ہیں کسی امر مکروہ کی توقع ایسی علامت سے جو ظنی ہو یا علم کی حد تک پہنچی ہوئی ہو۔ (غ) پس یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خوف کسی فرضی خیال کا نام نہیں بلکہ کسی بد نتیجہ کے ظاہر ہونے کی توقع ہے جس کی علامات ظنی یا یقینی طور پر ظاہر ہو چکی ہوں۔ اور یہاں مراد یقینی طور پر ہی علامات کا ظاہر ہونا ہے جس طرح اس سے اگلی آیت میں خِفْتُمْ سے مراد ہے تم پہچان لو۔ (غ) اور جس طرح دوسری جگہ ﴿وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا﴾[النسآء: 128:4] ''اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو۔'' میں خَافَتْ سے مراد عَلِمَتْ ہے یعنی جان لے۔ اسی طرح ﴿وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾[الأنفال: 58:8] ''اور اگر تجھے کسی قوم سے دغابازی کا خوف ہو تو (ان کا عہد) برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔'' میں بھی خوف سے مراد جان لینا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں خوف کی بنا پر حقوق و ذمہ داریوں پر اثر پڑتا ہو وہاں محض ظنی علامات پر کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی بلکہ یقینی علامات ہونی چاہئیں۔

نُشُوْزٌ۔ نَشَزَ سے ہے جس کے اصل معنی اٹھنا ہیں جیسے ﴿وَ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾[المجادلة: 11:58] ''اور جب کہا جائے اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔'' اور [نُشُوْزٌ بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ] یعنی میاں بی بی میں نُشُوْزٌ ان کا ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ یعنی ان میں موافقت کا نہ رہنا اس لیے لغت میں [نُشُوْزٌ بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ] کے معنی ہیں [كَرَاهِيَةُ كُلٍّ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ وَ سُوْءُ عِشْرَتِهِ] (ل) یعنی ہر ایک کا اپنے رفیق سے کراہت رکھنا اور اس سے بدسلوکی کرنا، لیکن بلحاظ حالات کے الگ الگ معنی یوں کیے ہیں۔ یعنی عورت کا نشوز مرد پر یہ ہے کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی نافرمانی کی اور اس سے بغض رکھا اور اس کی طاعت سے نکل گئی اور اس سے سخت دشمنی کی۔ اور خاوند کا نشوز عورت پر بھی یہی ہے اور یہ کہ اس کو مارے اور اس پر جفا کرے۔ (ل) چنانچہ دوسری جگہ آتا ہے ﴿وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا﴾[النسآء: 128:4]

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو۔ اللہ بلند بہت بڑا ہے۔ (653)

''اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو'' اور عورت کے مرد پر نشوز کے معنی اپنے خاوند سے بغض رکھنا اور اس کی طاعت سے اپنے آپ کو بالکل باہر نکال دینا اور اس کا اس سے ہٹ کر دوسرے کی طرف دیکھنا بھی کیے گئے ہیں۔ (غ)

نشوز کرنے والی عورتیں:

صَالِحَاتٌ کے ذکر کے بعد جو اپنے خاوند کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں، اب ان عورتوں کا ذکر کرتا ہے جو حقوق خاوند کی حفاظت نہیں کرتیں اور جن سے خاوند کے خلاف ارتکاب نشوز معلوم ہو۔ یعنی خاوند سے دشمنی، بغض، اس کی نافرمانی پر تلے رہنا، گھر میں نہ بسنا وغیرہ۔ یہ صرف وہ صورت ہے جس میں قصور صرف عورت کا ہو۔ جب مرد اور عورت دونوں کی طرف سے فساد کا خطرہ ہو اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا ہے اور جب عورت کا قصور کوئی نہ ہو مرد کا ہی قصور ہو تو اس کے لیے [آیت: 128] میں علاج بتایا ہے۔

653- ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ هَجَرَ کے معنی انسان کا اپنے غیر سے الگ ہو جانا ہیں۔ خواہ جسم سے الگ ہو یا زبان سے یا دل سے اور [هَجَرَ فِي الْمَضَاجِعِ] یعنی خوابگاہوں میں عورتوں سے مفارقت ان کے قریب نہ جانے سے کنایہ ہے۔ (غ)

عورت کے نشوز کی صورت میں تین علاج بتائے ہیں۔ اوّل اول جب نشوز ظاہر ہو تو صرف نصیحت پر اکتفا کرنا چاہیے' اگر نصیحت سے فائدہ نہ ہو تو اس سے بجائے محبت کے کسی قدر سختی کا برتاؤ کرنا چاہیے اور اس سے محبت کا میل جول اور محبت آمیز کلام ترک کر دیا جائے۔ خوابگاہوں میں الگ کرنے سے یہی مراد ہے۔ ایک شریف عورت کے لیے خاوند کی طرف سے ایسا سلوک کافی سزا ہے اور وہ فوراً اپنے رویہ میں اصلاح کر لے گی۔ لیکن جن عورتوں کو اس سے فائدہ نہ ہو ان کی فطرت ہی ایسی ہوگی کہ سختی کے سوا ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ طلاق کا ذرا سی بات پر دینا ٹھیک نہیں اس لیے ان کی اصلاح کے لیے ان کو مارنے کی اجازت بھی ہے۔

عورت کو مارنا کب اور کس حد تک جائز ہے؟ اس مارنے کی اجازت کو عیسائیوں نے اور بالخصوص آج کل کے مدعیان تہذیب عیسائیوں نے محل اعتراض ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر بیشتر عیسائی گھروں میں جو سلوک عورتوں سے ہوتا ہے وہ اس سے بدتر ہے جو مسلمانوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم ایک خاص طبقہ کے لیے نہیں۔ بلکہ تمام طبقات کے لیے ہے۔ اس لیے اس کی ہدایات میں بھی وسعت پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کر دیا جن سے اگر نادانی سے کوئی قصور سرزد ہو تو تھوڑی نصیحت ہی ان کے لیے کارگر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے قصور سے رجوع کرتی ہیں۔ پھر ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کر دیا جن کے لیے خاوند کا محبت سے نہ بولنا ہی کافی سزا ہے۔ پھر اس سے کس کو

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا اور اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو تو

انکار ہوسکتا ہے کہ ایک طبقہ عورتوں کا ہر ملک اور ہر قوم میں وہ ہے جن کے خیالات بہت سطحی ہیں اور جن کے لیے نہ نصیحت کارگر ہوتی ہے نہ محبت کے میل جول کے انقطاع سے ان پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ ایسی عورتوں کے لیے دو ہی راہیں کھلی تھیں یا یہ کہ ان کو طلاق دے کر ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا جائے یا یہ کہ ان سے کچھ اور زیادہ سختی برتی جائے۔ اسلام چونکہ طلاق کو [أَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللهِ] (سنن أبي داؤد، كتاب الطلاق، باب فِي كَرَاهِيَةِ الطَّلَاقِ: 2180) قرار دیتا ہے۔ اس لیے طلاق سے پہلے اصلاح کی ہر ایک مناسب صورت کی تلقین دیتا ہے اور عورتوں کے اس طبقہ کے لیے جن کا اخلاقی احساس گرا ہوا ہو بطور اصلاح مارنے کی اجازت بھی دی ہے۔

اس دلیل کی صداقت خود نبی کریم ﷺ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ چنانچہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ نے اس حدیث کو بیان کیا ہے کہ ایک موقعہ پر جب خاوندوں کی سختی کی شکایت نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا [لَقَدْ طَافَ بِآلِ مُحَمَّدٍ نِسَاءٌ كَثِيرٌ يَشْتَكِيْنَ أَزْوَاجَهُنَّ لَيْسَ أُولَئِكَ بِخِيَارِهِمْ] (سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب فِي ضَرْبِ النِّسَاءِ: 2148) یعنی ''ہمارے گھروں میں بہت سی عورتیں آئی ہیں جو اپنے خاوندوں کی شکایت کرتی ہیں۔ یہ لوگ تم میں سے اچھے لوگ نہیں۔'' اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ اجازت بی بی کو مارنے کی اعلیٰ طبقہ کے لیے نہیں بلکہ ادنیٰ طبقہ کے لیے ہے۔ پس جب تک ایک ایسا طبقہ دنیا میں موجود ہے جن کے لیے مار کی سختی کی ضرورت بھی ہے اور بہتیرے عیسائی خاوند اپنی عورتوں کو بڑی بڑی بے دردی سے بھی مارتے ہیں، تو اسلام کا یہ حکم قابل اعتراض نہیں۔ ہاں مزید احتیاط کے لیے نبی کریم ﷺ نے یہ بھی حکم دے دیا ہے کہ سخت ضرورت کے وقت اگر عورت کو مارا جائے تو وہ سخت مار نہ ہونی چاہیے بلکہ ایسی مار ہو جس کا اثر نہ ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں فرمایا [فَاتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ، فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٌ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ فَإِنْ فَعَلْنَ ذَلِكَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ] (صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حَجَّةِ النَّبِيِّ ﷺ: 3009) یعنی عورتوں کے بارہ میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمہارے گھر میں کسی دوسرے کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کو مارو مگر صرف ایسا جس کا اثر نہ ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مارنے کی اجازت سخت جرم پر ہے۔ **نبی کریم ﷺ کا اپنا پاک نمونہ** یہی ہے کہ آپ نے اپنی ساری عمر میں کبھی کسی بی بی کو مارا نہیں۔ حالانکہ آپ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور سوتوں میں اکثر جھگڑے ہوجاتے ہیں جن سے مرد غضب میں آکر ان پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ مگر آپ نے ایسے معاملات میں بھی ہمیشہ ایسی فراخدلی سے کام لیا کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کو اپنا نمونہ بنانا چاہتے ہیں وہ کبھی بھی اپنی بیبیوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے بلکہ [خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ] (جامع الترمذى، كتاب المناقب، باب فضل أزواج النبي ﷺ: 3895) کو مد نظر رکھ کر کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بی بی کے ساتھ بہترین سلوک کرنے والا ہو۔ اپنے حسن اخلاق کو گھر سے شروع کرنے کی کوشش کریں گے۔

حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

ایک فیصلہ کرنے والا اس (مرد) کے لوگوں میں سے اور ایک فیصلہ کرنے والا اس (عورت) کے لوگوں میں سے مقرر کرو اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے اللہ ان میں موافقت کر دے گا بے شک اللہ جاننے والا خبر دار ہے۔ (654)

آخر پر فرمایا کہ اگر بی بی اطاعت کرے تو پھر اس پر الزام لگانے کی راہ تلاش نہ کرو۔ اس کی اطاعت سے مراد یہاں اس کا اپنے نشوز کو ترک کر دینا ہی ہے۔ ان الفاظ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اوپر کی ترتیب تدریجی ہے۔ اگر پہلے مرحلہ پر وعظ و نصیحت سے عورت مان جائے تو دوسرے مرحلہ کی نوبت نہیں آنی چاہیے۔ ہاں پہلے مرحلہ پر نہ سمجھے تو پھر دوسرے طریق سے اس کو سمجھایا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا اول زبان سے نصیحت کرے۔ اگر رک جائے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ لیکن اگر انکار کرے تو اس سے مفارقت کرے۔ پھر بھی انکار کرے تو مارے، پھر بھی انکار کرے تو دو حکم مبعوث کیے جائیں۔

654- حَكَمًا۔ حَكَمٌ اور حَاكِمٌ قریباً ایک ہی معنی میں آتے ہیں اور اَلْحَكَمُ اور اَلْحَاكِمُ اور اَلْحَكِيْمُ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے شمار کیے گئے ہیں اور حَكَمَ کے اصل معنی ہیں روک دیا اور حَاكِمٌ کو حَاكِمٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ظلم سے لوگوں کو روکتا ہے اور حَكَمَ حَاكِمٌ سے زیادہ بلیغ ہے۔ (غ)

يُوَفِّقِ۔ وَفَّقَ سے ہے اور وِفْقٌ کے معنی دو چیزوں میں مطابقت ہیں جیسے ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ [النبأ: 26:78] ''بدلہ موافق (اعمال ہے)۔''

میاں بی بی میں باہم فساد کی صورت میں دو حکم مقرر کرنے کا حکم:

یہ وہ صورت ہے جب دونوں یعنی میاں بی بی میں فساد اور عداوت کی صورت ہو۔ ﴿شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ سے اس کو اس لیے تعبیر کیا کہ خاص طور پر ایک کی طرف فساد منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہ دیکھنے کو کہ ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے اور کس طرح پر موافقت میاں بی بی میں ہو سکتی ہے۔ دو حَکَم یا سرپنچ مقرر کرنے کا حکم ہے۔ ایک خاوند کے اہل میں سے ایک بی بی کے اہل میں سے کیونکہ ایسے حکم بہ نسبت اجنبیوں کے اصل حالات سے اور دونوں کے مزاج سے زیادہ واقف ہوں گے۔ فَابْعَثُوْا میں حکم حکام کو ہے۔ یعنی جو صاحب اختیار حاکم ہوں۔ اگر ایسے حاکم میسر نہ آئیں تو مسلمانوں کی جماعت ہی کا یہ کام ہے کہ بجائے اس کے کہ ایسے معاملات میں حاکم خود تحقیقات کرے اسے دو حکم مقرر کر دینے کا حکم ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ باہمی فساد یا رنجش کے معاملات میں بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جو عوام میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور عدالتوں کی کارروائی کھلی ہوتی ہے اور سب لوگوں کے علم میں آتی ہے۔ جن لوگوں نے عیسائی ممالک میں مقدمات طلاق کی کارروائیوں کو عدالتوں میں دیکھا ہے اور پڑھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ اس قسم کے مقدمات سے کس قدر فحش لٹریچر دنیا میں شائع ہوتا ہے اور اس کا کیسا مخرب اخلاق اثر دوسرے لوگوں پر ہوتا ہے۔ وہ اس حَکَم کی حکمت کو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ بجائے عدالت میں فیصلہ کے حَکَم مقرر

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی وَ الْيَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ بھی جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے (655)

کرنے کی ہدایت کیوں کی ہے۔ پھر دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ حکم جو اہل میں سے مقرر کیے جاتے ہیں وہ حالات سے، طبائع سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور غرض ان کی زیادہ تر اصلاح ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے جھگڑے میں حکم مقرر کر کے ان کے فیصلہ کو قطعی قرار دیا۔ مسلمانوں کا عمل ان ہدایات پر بالکل نہیں رہا اور اس لیے عورتیں سخت دکھ اٹھا رہی ہیں۔ کس قدر قابل تعریف ضابطہ تھا کہ اگر اختلاف بڑھتا ہوا نظر آئے تو دو پنچ موافقت کرانے کی کوشش کریں۔ ہاں موافقت بالکل ناممکن ہو تو طلاق دلا دیں۔ اب ہر ایک گھر میں اپنی حکومت ہے اور مرد جس طرح چاہتے ہیں عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ ساری قوم بھگت رہی ہے اور قرآن کریم کی تعلیم پس پشت پھینکی جا رہی ہے۔

655- ﴿الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ جَارِ وہ ہے جس کی جائے سکونت تمہارے قریب ہو۔ (غ) اور ﴿الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ سے مراد یا قریب کا ہمسایہ ہے یا قریبی تعلق والا ہمسایہ بلحاظ نسب ہو یا اخوتِ دینی۔

الْجَارِ الْجُنُبِ۔ جَنْبٌ کے اصل معنی پہلو ہیں۔ جَنَبَ۔ اَجْنَبَ ایک پہلو پر یا دور ہو گیا۔ الْجَارِ الْجُنُبِ دور کا پڑوسی ہے کیونکہ چالیس گھر تک پڑوس کا حق ہے اور یا مراد ایسا پڑوسی ہے جس سے نسب کا یا اخوت قومی کا تعلق نہیں مثلاً ہندو یا عیسائی۔

﴿الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ کے لفظی معنی پاس کا ساتھی یا ہم نشین ہیں۔ رفیق سفر، رفیق تعلیم، رفیق پیشہ، رفیق مسجد سب اس کے اندر آجاتے ہیں۔

قرآن کریم ہمیشہ خاص سے عام اور عام سے خاص کی طرف رجوع فرماتا ہے۔ بیبیوں سے حسن سلوک کے نصائح کو تمام کر کے اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلا کر اب **کل مخلوقات سے حسن سلوک** کی طرف اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مگر مخلوقات سے حسن سلوک کی اصل بنا یہ ہے کہ ان سب کا خالق ایک ہے۔ اس لیے اللہ کی عبادت سے شروع کیا، پھر ماں باپ سے احسان کا ذکر کیا، پھر قریبیوں سے، پھر یتیموں اور مسکینوں سے، پھر پڑوسیوں سے۔ احسان یا نیکی کرنے کی تعلیم ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ مگر **اسلام نے پڑوسی کے حق کو بہت وسیع کیا ہے** اور دو قسم کے ہمسایوں کا ذکر کیا ہے۔ اول قریبی یا قرابت والے ہمسائے۔ دوسرے دور کے یا اجنبی ہمسائے۔ اور یوں یہود و نصاریٰ، مشرکین تک کو اس احسان میں شامل کر لیا ہے۔ احادیث اس بارہ میں بکثرت مروی ہیں کہ نبی کریم ﷺ پڑوسیوں سے کس قدر حسن سلوک کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ صحیحین میں ایک

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾

اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا فخر کرنے والا ہے۔(656)

حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''جبریل مجھے ہمسایہ کے متعلق کہتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ اس کو ورثہ دلایا جائے گا۔'' پھر صاحب بالجنب کے ساتھ احسان کی تاکید فرمائی۔ یعنی جو شخص ایک انسان کے پاس بیٹھتا ہو مثلاً ایک استاد کے دو شاگرد یا ایک پیشہ کے دو شریک یا ایک دفتر کے دو ملازم یا ایک تجارت کے دو کرنے والے یا ایسے شخص جو کبھی سفر یا حضر میں ایک دوسرے کے ہم نشین ہوئے ہوں۔ مسجد میں دو نماز پڑھنے والے بھی ایک دوسرے کے صاحب بالجنب ہو جاتے ہیں۔ پھر اس سے اتر کر مسافر ہیں اس لیے کہ گو ان کا تعلق تو انسان سے کسی قسم کا نہیں مگر وہ مدد کے محتاج ہیں۔ اور سب سے آخر وہ جن پر انسان کا تصرف ہے خواہ انسان ہوں، جیسے نوکر یا غلام جو قید ہو کر انسان کے تصرف میں آجاتے ہیں۔ یا حیوان جو انسان کی ملک میں ہیں۔ کیونکہ حیوان بھی انسان کی نیکی کے محتاج ہیں۔ بیبیوں سے حسن سلوک کے ذکر کے بعد اس ذکر کو لانے کا منشاء یہ ہے کہ ایک نیکی سے دوسری نیکی کی طرف قدم اٹھے جیسا کہ [خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ] (جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب فضل أزواج النبي ﷺ: 3895) میں فرمایا ہے۔ گویا بی بی سے حسن سلوک سے دوسروں سے حسن سلوک کی طرف قدم اٹھتا ہے۔

غلاموں سے حسن سلوک میں اسلام نے ایسا کمال دکھایا ہے جس کی نظیر کسی مصلح میں ہم کو نہیں ملتی۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی آخری نصیحت مسلمانوں کو یہی تھی اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری وقت میں آپ یہ لفظ دہراتے جاتے تھے [الصَّلَاةَ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ الصَّلَاةَ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ] (سنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ذكر مرض رسول الله ﷺ: 1625) ''نماز اور تمہارے مملوک۔'' یعنی ان ہر دو کی بہت خبر رکھو اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ جو کھانا پکے یا جو انسان خود کھائے اس میں سے کچھ اپنے غلام یا خادم کو بھی کھلائے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے [فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدَيْهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ] (صحيح مسلم، كتاب الأيمان، باب إِطْعَامِ الْمَمْلُوكِ مِمَّا يَأْكُلُ وَإِلْبَاسِهِ مِمَّا يَلْبَسُ وَلاَ يُكَلِّفُهُ مَا يَغْلِبُهُ: 4405) یعنی ''جس کے تصرف میں اس کا بھائی ہو تو چاہیے کہ جو خود کھاتا ہے اسے کھلائے۔ اور جو خود پہنتا ہے اسے پہنائے اور ان پر اس قدر کام کی مشقت نہ ڈالو جس کے نیچے وہ دب جائیں اور اگر تم ان کو مشقت کا کام دو تو ان کی مدد کرو۔'' ایسا ہی حیوانات کے ساتھ نیکی کا حکم بھی احادیث میں پایا جاتا ہے۔

656- مُخْتَالًا۔ اس کا مادہ خَيْلٌ ہے اور خیال ایک مشہور لفظ ہے اسی سے خُيَلَاءَ ہے جس کے معنی تکبر ہیں۔ کیونکہ انسان اپنے نفس کے لیے ایک فضیلت کا خیال باندھ لیتا ہے۔ (غ) اور اسی سے حدیث میں آتا ہے: [مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ] (صحيح البخاری، كتاب فضائل الصحابة، باب: 3665) یعنی ''جو اپنا کپڑا تکبر سے نیچا چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔'' اور اِخْتَالٌ کے معنی ہیں وہ متکبر ہوا۔ اور مُخْتَالٌ وہ مالدار بخیل ہے جو بڑا بنتا ہے۔ وہ جاہل جو اپنے

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾

جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے۔ اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (657)

قریبیوں سے جب وہ محتاج ہوں یا اپنے ہمسایوں سے جب وہ محتاج ہوں عار کرتا ہے۔ (ل)

فَخُوْرٌ۔ فَخَرَ سے ہے جس کے معنی ہیں ان چیزوں میں جو انسان سے باہر ہیں، میں اپنی بڑائی ظاہر کرنا۔ (غ) جیسے مال اور مرتبہ۔ پس **مُخْتَالٌ اور فَخُوْرٌ میں ایک فرق** تو یہ ہے کہ مُخْتَالٌ اپنے نفس کو فضیلت دینے سے کہلاتا ہے اور فَخُوْرٌ مال و مرتبہ وغیرہ کی بڑائی کی وجہ سے۔ اور دوسرے یہ کہ مختال اپنے طرز عمل سے بنتا ہے یعنی اس کا سلوک دوسروں سے متکبرانہ ہوتا ہے اور فَخُوْرٌ زبان سے اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کے پاس مال کا ہونا یا اس کا بلند مرتبہ پر ہونا یا اس کا اپنے جسم اور لباس کو اچھی حالت میں رکھنا یہ امور تکبر میں داخل نہیں۔ بلکہ تکبر صرف وہی ہے جہاں دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہو۔ چنانچہ ثابت بن قیس سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس تھے تو آپ نے یہ آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ پڑھی اور تکبر اور اس کی برائی کا ذکر کیا تو ثابت رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ کیوں روتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو ایک ایسا آدمی ہوں کہ خوبصورتی سے محبت رکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میری جوتی کا تسمہ بھی خوبصورت ہو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''پھر تو تم اہل جنت میں سے ہو۔'' [اِنَّهٗ لَيْسَ بِالْكِبْرِ اَنْ تُحْسِنَ رَاحِلَتَكَ وَ رَحْلَكَ وَلٰكِنَّ الْكِبْرَ مَنْ سَفِهَ الْحَقَّ وَ غَمَصَ النَّاسَ] (ر) یہ تکبر نہیں کہ تم اپنی سواری اور پالان کو اچھا بناؤ بلکہ متکبر وہ ہے جو حق کو ہلکا جانتا ہے اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ آج کل کی تہذیب اکثر لوگوں کو مُخْتَالٌ اور فَخُوْرٌ ہی بناتی ہے۔ وہ خود بڑے بن کر لوگوں کو حقیر و ذلیل جانتے ہیں اور ان کو پورا انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں دیتے، احسان یا نیکی کا کرنا تو ایک طرف رہا۔ جب پہلے حصہ آیت میں مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم دی تو اسی مناسبت سے اس کا خاتمہ ان لوگوں کے ذکر پر کیا جو بجائے دوسروں سے احسان کرنے کے ان پر اپنی بڑائی جتاتے اور ان کے حقوق کو پاؤں تلے روندتے ہیں۔

657- اس آیت میں مُخْتَالٌ و فَخُوْرٌ کا ایک وصف بیان کیا ہے کہ یہ لوگ خود بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی ہدایت کرتے ہیں۔ گویا یہ بدی ان کے نزدیک اس قدر محبوب ہوگئی ہے کہ وہ دوسروں کو بجائے نیکی کا حکم کرنے کے اس بدی کا حکم کرتے ہیں۔ پھر تیسرا مرتبہ ان کے انتہائے بخل کا یہ بیان کیا کہ جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ مثلاً علم کے متعلق بھی بخل کرتے ہیں۔ یا اپنے اخلاق میں بھی دوسروں سے بخل کرتے ہیں۔ اگر خود کچھ علم حاصل کر لیں تو اب

وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

اور جو اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ پیچھے آنے والے دن پر اور جس کا ساتھی شیطان ہو تو وہ بہت ہی برا ساتھی ہے۔ (658)

وَ مَا ذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

اور ان پر کیا (وبال) آجاتا اگر یہ اللہ اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لاتے اور اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ نے ان کو دیا تھا اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ (659)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ

اللہ ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر وہ نیکی ہو (تو) وہ اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے

یہ نہیں چاہتے کہ دوسروں کو بھی وہ علم دیں۔ اور آخر میں ﴿وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہ اوصاف کافروں کے ہیں۔

658- قَرِيْنٌ۔ قَرْنٌ سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع ہے۔ خواہ وہ اجتماع کسی معنی میں ہو۔ شیطان کا قرین انسان ہونا بدی میں اس کا ساتھی ہونے کے لحاظ سے ہے۔

اس میں مُخْتَالٌ فَخُوْرٌ کا دوسرا وصف بیان کیا کہ اگر ایک طرف بخل کرتا ہے تو دوسری طرف محض دکھاوے کے لیے نمود کے طور پر رسم و رواج کے اتباع میں برادری اور بڑائی کے خیال سے اپنا مال خرچ بھی کرتا ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی حالت دیکھی جائے تو کثیر حصہ اسی کا مصداق ثابت ہوگا۔ حکام کو خوش کرنے کے لیے، برادری میں ناک رکھنے کے لیے اور دکھاوے کے رنگ میں جائداد بھی بیچ لیں گے۔ مگر خدا کی راہ میں دینے کا نام آئے تو چند پیسے خرچ کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

659- ﴿مَاذَا عَلَيْهِمْ﴾ توبیخ کے لیے ہے اور مراد ہے کہ کیا وبال یا ضرر ان کو پہنچتا اگر یہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے۔

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ دکھاوے کے لیے خرچ کرنے والوں کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر کچھ نہیں ہوتا جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے ہچکچاتا ہے درحقیقت اس کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر بھی کم ہوتا ہے۔ اور یہاں ﴿اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ سے مراد ایمان کامل ہی ہے۔ وہی ایمان جس کا ذکر اس قسم کی آیات میں آتا ہے۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ [النساء: 136:4] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔''

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ بڑا اجر دیتا ہے۔(660)

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے اور تجھ کو ہم ان پر گواہ لائیں گے۔(661)

660- مِثْقَالٌ۔ ثَقَلَ سے ہے اور مِثْقَالٌ کے معنی ہیں وہ جس کے ساتھ وزن کیا جائے اور وہ ایک خاص وزن بھی ہے جو چوبیس قیراط کے برابر ہے اور مطلق مقدار پر بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں مقدار ہی مراد ہے۔

ذَرَّةٍ۔ ذَرَرٌ سے مشتق ہے۔ ذَرَّ الشَّیْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کو انگلیوں کی پوروں سے لینا پھر اس کو کسی چیز پر چھڑک دینا اور ذرّۃ (جس کی جمع ذرّ آتی ہے۔) چیونٹی کے نئے پیدا ہوئے ہوئے چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں۔ ان میں سے سو کا وزن ایک جو کے دانہ کے برابر ہوتا ہے اور بعض نے کہا کہ ذرہ کا وزن کچھ نہیں ہوتا اور وہ وہ چیز ہے جو کسی مکان میں سورج کی کرنیں داخل ہوں تو اڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ (ل) کچھ وزن نہ ہونے سے بھی مراد اتنا کم وزن ہوتا ہے کہ ہوا میں وہ ذرات خود بخود اڑتے ہیں۔ بعض نے چھوٹی سرخ چیونٹی کو ذرہ کہا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ اس چیونٹی کا سر ذرۃ کہلاتا ہے۔ (ر)

یہ آیت پچھلی آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔ پچھلی آیت میں انفاق اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا تھا کہ جو کچھ کوئی خرچ کرے گا اللہ اس کو جانتا ہے۔ یعنی اس کا اجر دے گا۔ اگر اجر نہ دے تو گویا اس نے ایک نیک فعل کے اجر کو ضائع کر دیا۔ اور یہ ایک ظلم ہے مگر خدا کی ذات میں ایک ذرہ برابر بھی ظلم روا نہیں رکھا جا سکتا۔ پس اصل غرض یہی سمجھانا ہے کہ اللہ کسی اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اگر وہ فعل حسنہ یعنی نیکی کا ہے تو ضائع کرنا کہاں، اس کو اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھاتا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ ان اصول کو چھوڑ کر مسلمان دکھ اور تکلیف اٹھائیں گے وہ خدا کی طرف سے ظلم نہیں۔

661- یہاں بتایا کہ مسلمانوں کے مصائب رسول کی تعلیم سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے **رسول کی شہادت** کا ذکر کیا اور بتایا کہ جس طرح دوسری امتوں کے رسول ان امتوں پر گواہ ہوں گے، اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ امت محمدیہ پر گواہ ہوں گے۔ هٰٓؤُلَآءِ میں اشارہ بعض مفسرین نے انبیائے سابقین یا ﴿مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ﴾ کی طرف لیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ هٰٓؤُلَآءِ سے مراد امت محمدیہ ہے اور یہ اسی کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا: ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرة: 143:2] ''تاکہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔'' اور صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔'' تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! میں آپ کو پڑھ کر سناؤں اور آپ پر تو نازل ہی ہوا ہے؟ فرمایا: ہاں مجھے پسند آتا ہے کہ میں دوسروں سے سنوں۔ تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ یہاں تک کہ آپ اس آیت پر آئے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا بس کرو اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ابن ابی حاتم نے ایک دوسرے صحابی سے اس حدیث کو یوں بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور صحابی تھے تو آپ

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ ع 6 9 3

اس دن وہ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی آرزو کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جاتی اور اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔ (662)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو نماز کے نزدیک نہ جاؤ جب تم

اسی طرح قرآن کریم سن رہے تھے جب پڑھنے والا اس آیت پر پہنچا تو نبی کریم ﷺ رو پڑے اور فرمایا [يَا رَبِّ هٰذَا شَهِدْتُ عَلٰى مَنْ أَنَا بَيْنَ أَظْهُرِهِمْ فَكَيْفَ بِمَنْ لَمْ أَرَهُ] (ث) ''اے رب! ان پر تو میں گواہی دوں گا (یعنی یہ کہ انہوں نے میری فرمانبرداری کی) جو میرے سامنے ہیں لیکن ان کی گواہی کس طرح دوں گا جن کو میں نے نہیں دیکھا'' اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں هٰٓؤُلَآءِ سے مراد آپ کے پیرو ہی ہیں۔ اسی کی تائید میں ابن جریر نے ایک حدیث بیان کی ہے جس کے راوی ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی ہیں کہ اس موقعہ پر پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ﴾ [المائدة: 117:5] یعنی ''میں ان پر گواہ ہوں جب تک میں ان میں ہوں۔ پھر جب تو مجھ کو وفات دے تو تو ہی ان پر نگران ہے۔'' اور اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو آیت قرآنی ﴿فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ﴾ کے نیچے انہوں نے بیان کی ہے۔ پس نبی کریم ﷺ کا رونا اس لیے تھا کہ آپ کو امت کی پچھلی حالت کی خبر دی گئی تھی۔

662- ﴿الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ﴾ میں بعض نے ﴿وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ﴾ کو جملہ معترضہ قرار دیا ہے بمعنی [وَ قَدْ عَصَوُا الرَّسُوْلَ] یعنی انہوں نے رسول کی نافرمانی کی تھی۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کا کفر رسول کی نافرمانی ہے اور یا اصل مقصود تو رسول کی نافرمانی کرنے والوں کا ذکر ہے جیسا کہ پچھلی آیت سے ظاہر ہے۔ لیکن ساتھ کفار کا ذکر بھی بڑھا دیا ہے اور یوں بتا دیا ہے کہ رسول کی نافرمانی کرنے والا گروہ کافروں کے ساتھ ملتا ہے۔ جزا و سزا کے وقت یہ خواہش کریں گے کہ مٹی میں ملے رہتے اور ان کی دوبارہ زندگی نہ ہوتی یا یہ کہ وہ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔

جو لوگ حقوق العباد ادا نہیں کرتے یا حقوق اللہ ادا نہیں کرتے اور یوں رسول کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے ذکر کو کفار کے ذکر کے ساتھ مقرون کر کے فرمایا کہ جب جزا و سزا کا وقت آئے گا تو پھر ان لوگوں کو اپنی زندگی پر افسوس ہوگا اور وہ چاہیں گے کہ وہ دوبارہ نہ اٹھائے جاتے اور زمین میں ہی دبے رہتے۔ مگر وہ ایسا وقت ہوگا کہ جو کچھ کیا ہے سب ظاہر ہو جائے گا۔ اور جس طرح دنیا میں چھپ چھپ کر بدیاں کر لیتے ہیں وہ اخفا کا پردہ وہاں نہ رہے گا اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے اور یا ﴿لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ﴾ کی طرح یہ بھی ان کی خواہش ہے اور اس کا تعلق ﴿يَوَدُّ الَّذِيْنَ﴾ سے ہے یعنی ایک تو یہ خواہش کریں گے کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے اور دوسرے یہ کہ انہوں نے اللہ سے کوئی بات دنیا میں چھپائی نہ ہوتی اور اس کے دیئے ہوئے قویٰ کو ٹھیک محل پر لگایا ہوتا کیونکہ ان قویٰ کا اپنے محل پر نہ لگانا یہ بھی كِتْمَانٌ میں ہی داخل ہے۔

اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى

نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں سوائے اس کے راستہ گزر رہے ہو یہاں تک کہ غسل کرلو۔(663) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو

663- الصَّلٰوۃ کے معنی بیان ہو چکے [دیکھو نمبر: 12] اور نماز کی جگہ کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں۔(غ) ﴿لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ﴾ [الحج: 40:22] ''تو یقینا راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں گرادی جاتیں۔'' جہاں صلوٰت سے مراد عام عبادت گاہیں ہیں یا کنائس یعنی یہودیوں کی عبادت گاہیں۔ یہاں لفظ صلوٰۃ سے مسجد مراد ہے اور چونکہ اصل نماز مساجد میں ہی ہے اس لیے نماز کا مفہوم خود اس کے اندر شامل ہے۔

سُكٰرٰى۔ سُكٰرَانُ کی جمع ہے جو سُكْرٌ سے ہے۔ یعنی وہ حالت جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہوتی ہے۔(غ) یعنی جب اس کے ہوش وحواس پورے درست نہیں ہوتے۔ اور اس کا اکثر استعمال شراب میں ہے یعنی شراب پی کر جب انسان کی عقل جاتی رہے تو اس کو سکران کہا جاتا ہے۔ لیکن غضب وعشق وغیرہ سے بھی یہ حالت انسان کو پہنچتی ہے۔(غ) اور لسان العرب میں ہے کہ سُكْرٌ تین ہیں یعنی جوانی کا سکر اور مال کا سکر اور غلبہ کا سکر اور اسی میں آیت زیر بحث کی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک یہاں سُكْرَ النَّوْمُ مراد ہے۔ یعنی نیند کا نشہ یا وہ حالت جب نیند کے غلبہ سے انسان کی عقل میں فتور آجاتا ہے اور [سَكْرَةُ الْهَمِّ وَالنَّوْمِ] بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی غم اور نیند میں سَكْرَةٌ کی حالت ہوجانا اور قرآن کریم میں [سَكْرَةُ الْمَوْتِ] آیا ہے اور یہ وہ حالت ہے جب موت کی شدت سے غشی آتی ہے۔

جُنُبٌ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو اور اس کا استعمال مذکر مونث واحد جمع میں یکساں ہوتا ہے اور اس کا اشتقاق جَنْبٌ سے ہے جس کے معنی پہلو ہیں۔(غ) اور اس کو حالت جنابت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس حالت میں حکم شریعت میں نماز سے ایک طرف رہنا چاہیے۔ اور نہایہ میں ہے کہ جُنُبٌ وہ ہے جس پر جماع اور خروج منی سے غسل واجب ہے۔

﴿عَابِرِیْ سَبِیْلٍ﴾ عَابِرِیْ عبور کرنے والے۔ ﴿عَابِرِیْ سَبِیْلٍ﴾ سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک راستہ گزرتے ہوئے ہے۔ یعنی مسجد میں صرف گزر جانا حالت جنابت میں جائز ہے بیٹھنا جائز نہیں۔ اور بعض نے ﴿عَابِرِیْ سَبِیْلٍ﴾ کے وسیع معنی مسافر لیے ہیں۔ یعنی حالت سفر کو حکم سے مستثنیٰ کیا ہے۔

پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی اس رکوع میں یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام سے انسان انحراف کرتا ہے تو اس کی نوبت کہاں تک پہنچتی ہے اور چونکہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر انسان بڑی بڑی بلاؤں میں مبتلا ہوجاتا ہے اس لیے سب سے پہلے نماز کے ذکر سے اس مضمون کو شروع کیا۔ کیونکہ نماز تزکیہ نفس انسانی کے لیے سب سے بہتر علاج ہے مگر **ایک مسلمان کی نماز کیسی ہو اس کے ساتھ سکر اور جنابت کی حالت جمع نہیں ہوسکتی**۔ اس لیے کہ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے لذت کو حاصل کر چکا ہے اس لیے وہ کمال لذت جو ذکر

سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ	ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا تم نے
لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً	عورتوں کو چھوا ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد
فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا	کرو۔ پھر اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔

الٰہی میں حاصل ہوتی ہے اس کو ادنیٰ لذات نفسانی سے ممتاز کر دیا ہے۔ جنابت اور حالت سکر کو اکٹھا کرنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ دونوں میں اعلیٰ درجہ کا جسمانی سرور انسان کو حاصل ہوتا ہے اور نماز کو دونوں حالتوں میں روک کر بتایا ہے کہ وہ روحانی سرور جو نماز سے حاصل ہوتا ہے اس کا کیسا بلند مقام ہے کہ ان جسمانی سروروں کو اس کے مقابلہ میں کوئی وقعت حاصل نہیں۔ اسی مضمون کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ ہے [حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَاكُمُ الطِّيبُ وَالنِّسَاءُ، وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ] (مسند الإمام أحمد:جلد21، صفحہ 433) ''تمہاری دنیا سے میری طرف خوشبو اور عورت کو محبوب بنا دیا گیا ہے۔ مگر میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور میری حقیقی راحت نماز میں ہے۔'' یعنی گو ان چیزوں میں انسان کے لیے سرور اور لذت ہے مگر قرت عین یا حقیقی راحت صرف نماز میں یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں ہے۔

شراب کی قطعی حرمت سے پہلے حالت سکر سے روکا:

﴿وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ کی تفسیر میں عموماً مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہاں سکر سے مراد نشہ شراب ہے اور کہ یہ سورۃ مائدہ میں شراب کی حرمت کا قطعی حکم نازل ہونے سے پہلے کی آیت ہے جو حرمت شراب میں ایک ضروری تدریجی مرحلہ تھا اور بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دعوت میں بعض مسلمانوں نے شراب پی لی اور جب نماز کا وقت آیا تو قرآن کریم کی سورۃ ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ۝﴾ [الكافرون: 109:1-2] ''کہہ دے اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔'' کو غلط پڑھ دیا۔ جس سے معنی میں فرق آ گیا اور اس پر یہ تحریم نازل ہوئی۔ لیکن اگر سکر سے مراد شراب کا ہی نشہ لیا جائے تو بھی اصل غرض یہاں سکر سے روکنے کی ہے۔ کیونکہ پانچ اوقات نماز کی تقسیم دن رات میں اس طرح ہے کہ جو شخص حالت سکر میں ہوگا وہ کسی نہ کسی نماز میں شامل ہونے سے رہ جائے گا اور اصل مقصود یہ نہیں کہ جب نشہ ہو جائے تو نماز مت پڑھو۔ بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ نماز تو تم نے پڑھنی ہے مگر حالت نشہ میں نماز بے معنی ہے اس لیے نشہ کی حالت سے بچو اور حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا [اِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّي، فَلْيَنْصَرِفْ وَلْيَنَمْ، حَتَّى يَعْلَمَ مَا يَقُولُ] (مسند أحمد:جلد19، صفحہ 432) ''جب تم میں سے کسی کو اونگھ آ جائے جب وہ نماز پڑھ رہا ہو تو چاہیے کہ واپس چلا جائے اور سو لے یہاں تک کہ جو کچھ کہتا ہے اسے جانے۔'' جس سے معلوم ہوتا ہے نبی کریم ﷺ نے نیند کی حالت کو اسی حکم میں شامل کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے حالت سکر سے مراد یہاں صرف نیند کا نشہ لیا ہے۔

بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

بے شک اللہ معاف کرنے والا مغفرت کرنے والا ہے۔(664)

نماز کے لیے حضور قلب کی ضرورت:

الفاظ ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ سے اس حکم کی علت غائی معلوم ہوتی ہے کہ نماز ایک بے معنی حرکت نہیں۔ نہ صرف کھڑے ہونے، رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا نام نماز ہے حالانکہ یہ نماز کے ارکان ہیں۔ نہ صرف چند الفاظ منہ سے کہنے کا نام نماز ہے۔ حالانکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی بلکہ اصل نماز یہ ہے کہ انسان کا دل کسی خاص طرف لگا ہو اور اس کو یہ علم ہو کہ میرے اس فعل کا اور میرے ان الفاظ کا یہ منشا ہے۔ پس اصل نماز تو قلب کی ہے یعنی قلب پر ایک خاص حالت کا وارد ہونا اور ظاہر افعال صرف اس حالت قلبی کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ کس قدر معمولی الفاظ میں ایک باریک حکمت کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ دوسرے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو نماز کے بالخصوص اور قرآن کریم کے عموماً معنی اور مفہوم معلوم ہونے چاہئیں۔ جو لوگ صرف لفظوں کو بغیر ان کی اصلیت اور ان کے معنی جاننے کے رٹتے رہتے ہیں وہ ایک نہ ایک رنگ میں ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ کے ماتحت آ جاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کے ہر بچہ کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ کیونکہ جس نے تعلیم حاصل نہیں کی وہ الفاظ کے معنی کس طرح جان سکتا ہے۔

664- الْغَآئِطِ۔ غَوْطٌ اس کا مادہ ہے اور غَائِط کے معنی ہے کھودا۔ (ل) اس لیے غائط وسیع پست زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ لوگ قضائے حاجت کے لیے پست زمین کو جاتے تھے تا کہ نظروں سے پوشیدہ ہو جائیں اس لیے اَتَی الْغَائِطَ سے کنایۃً بول و براز وغیرہ مراد ہو گیا اور شریعت نے اس میں توسیع کر کے اخراج ہوا کو بھی شامل کیا ہے۔

لٰمَسْتُمُ۔ لَمَسَ۔ مَسَّ کی طرح ظاہر جلد کے چھونے کو کہتے ہیں اور مُلَامَسَةٌ جس سے لٰمَسْتُمُ آیا ہے اور کنایۃً مرد اور عورت کے تعلق پر بولا جاتا ہے۔

صَعِيْدًا۔ صُعُوْدٌ کے معنی اوپر چڑھنا ہیں اور [صَعِيْدٌ، وَجْهُ الْاَرْضِ] یعنی سطح زمین کو کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک غبار کو جو اوپر چڑھ جاتا ہے۔ (غ) اس لیے تیمم میں بعض کے نزدیک سطح زمین پر ہاتھ مارنا کافی ہے خواہ اس میں گرد و غبار ہو یا نہ ہو جیسے پتھر اور بعض کے نزدیک غبار کا ہاتھ کو لگنا ضروری ہے۔

اَمْسَحُوْا۔ مَسَحَ کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا گزارنا اور اس سے نشان کو مٹا دینا ہیں۔ الگ الگ دونوں مفہوموں پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

تیمم:

جب حالت جنابت کا ذکر آیا اور اس کے ساتھ تطہیر یعنی غسل کا ذکر آیا جو اعلیٰ درجہ کی تطہیر ہے تو ساتھ ہی تیمم کا ذکر بھی کر دیا جو ادنیٰ درجہ کی تطہیر ہے اور گو بظاہر معلوم نہ ہو کہ مٹی سے تطہیر کس طرح ہو سکتی ہے۔ لیکن سچ یہی ہے کہ پانی اور مٹی دونوں پاک کرنے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾

کیا تو نے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ گمراہی کو خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم راستہ سے بہک جاؤ۔

وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ ہی کافی دوست ہے اور اللہ ہی کافی مددگار ہے۔ (665)

والی چیزیں ہیں۔ اور تیمم کو اس لیے بھی ضروری ٹھہرایا کہ تا نماز کے لیے ایک قسم کی تیاری انسان کے اندر پیدا ہو اور شاید مٹی پر ہاتھ مارنے میں انسان کے عجز کی طرف بھی اشارہ ہو اور یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ گو وضو اور غسل سے طہارت ظاہری بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ اچھی چیز ہے۔ مگر نماز کا اصل مقصود طہارت باطنی ہے۔ یہاں بیماری اور سفر اور حدث اصغر اور حدث اکبر کو اَوْ کے ساتھ جمع کیا ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ انسان سفر میں نہ ہو اور پھر بھی پانی نہ ملے مثلاً پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا ایسے مقامات میں جہاں پانی بافراط دستیاب نہیں ہوتا یا صرف پینے کے لیے دستیاب ہوسکتا ہے۔

تیمم کا طریق:

مسح کے طریق میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارنا چاہیے۔ پہلی دفعہ منہ پر پھیرے اور دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں پر اور بعض نے ہاتھوں کو کفوں تک لیا ہے۔ مگر دو دفعہ ہاتھ مٹی پر مارنا ضروری قرار دیا ہے۔ مگر دو دفعہ ہاتھ مارنے کی روایات ضعیف ہیں اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک ہی دفعہ ہاتھ مارنے اور صرف كَفَّيْنِ تک ہاتھ پھیرنے کا طریق خود ہی بتایا ہے۔ چنانچہ عمار رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ خود بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ جب وہ کسی سریہ میں تھے تو جنابت کی حالت میں ہوگئے تو آپ تیمم کے لیے مٹی کے اندر لوٹے کیونکہ پانی نہ تھا۔ جب آپ نے یہ ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا۔ تو آنحضرت ﷺ ہنسے اور فرمایا کہ تمہیں صرف اس قدر کافی تھا [وَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِيَدِهِ الأَرْضَ ثُمَّ نَفَخَ، وَمَسَحَ بِهَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ] (سنن الدارقطني: جلد1، صفحہ 183) یعنی نبی کریم ﷺ نے زمین پر ہاتھ مارے پھر اس پر پھونک ماری (تا کہ زائد مٹی اڑ جائے) پھر آپ نے اپنے منہ اور دونوں کفوں پر مسح کیا۔

665- [آیت: 44, 45] میں یہود کا ذکر ہے۔ جیسا کہ تصریح سے [آیت: 46] میں بیان کر دیا ہے۔ یہود کی حالت پر مسلمانوں کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جب انسان نیکی اور پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑتا ہے تو اس کی حالت کہاں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ ان کی حالت کا انجام بتایا ہے کہ نیکی کی راہوں کو چھوڑ کر نیکی سے محبت ہونے کی بجائے نیکی سے اس قدر عداوت اور بدی سے اس قدر محبت ہوگئی ہے کہ بدی کو اختیار کرنے کے لیے اب اپنے مال بھی خرچ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر تمہاری بھی یہی حالت نہ ہو جائے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے بعض باتوں کی ان کے موقعوں سے تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سن لیا اور ہم نہیں مانتے' اور سن تو نہ سنوایا جائے اور راعِنا اپنی زبانیں مروڑتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے۔ اور اگر وہ (یوں) کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم فرمانبرداری کرتے ہیں اور سنیے اور انظرنا تو ان کے لیے بہت اچھا اور درست ہوتا لیکن اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کی سو وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ (666)

666- ﴿عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ مَوَاضِعُ۔ مَوْضِعٌ کی جمع ہے جو وَضَعَ سے ہے۔ کلمات کے مواضع ان کے مقام ہیں یا ان کے مفہوم۔ مقام سے کلمات کا بدلنا **تحریف لفظی** ہے اور مفہوم سے بدلنا **تحریف معنوی** ہے۔ اور یہودی دونوں قسم کی تحریف کرتے تھے۔ مائدہ میں ہے ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ [المآئدۃ: 41:5] ان کے موضعوں کے بعد ان کی تحریف کرتے ہیں۔ یعنی حالانکہ ان کلمات کے موقع بیان کر دیئے گئے ہیں پھر بھی وہ تحریف کرتے ہیں۔

﴿وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ کے ایک معنی تعریفی بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی سن تجھے کوئی مکروہ بات نہ سنائی جائے اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ [اِسْمَعْ مَدْعُوًا عَلَيْكَ بِلَا سَمِعْتُ] سن لے تو نہ سنے۔ کیونکہ سن وہ نہیں سکتا جو بہرا ہو۔ اور ﴿غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ میں سَمِعَ کے معنی قبولیت بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی تیری بات قبول نہ کی جائے۔ پس یہ کلام رَاعِنَا کی طرح ذو وجہین ہے۔

طَعَنَ۔ اصل میں نیزہ مارنے پر آتا ہے مگر زبان کے ساتھ کسی کی عزت وغیرہ پر ہاتھ ڈالنے کو بھی طعن کہتے ہیں اس لیے طَعَنَ فِيْهِ کے معنی ہیں اس کو عیب لگایا۔ (ل)

اَقْوَمَ۔ قَامَ سے تفضیل ہے اور اَقْوَمَ سے مراد اَعْدَلُ ہے یعنی فی نفسہٖ زیادہ انصاف کی یا زیادہ راستی کی بات۔

یہودیوں کا نبی کریم ﷺ سے طرز عمل:

اس آیت میں یہودیوں کی قساوت قلبی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو ان کا سلوک تھا اس کا ذکر کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی اپنی کتب میں تحریف کا مفصل ذکر دوسری جگہ آ چکا ہے [دیکھو نمبر: 100]۔ مگر یہاں ان کی جس تحریف کا ذکر ہے وہ وہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے کلام میں وہ کرتے تھے۔ جیسا کہ سیاق کلام سے صاف ظاہر ہے۔ بعض یہودی آپ کے پاس آ بھی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اے لوگو! جن کو کتاب دی گئی ہے اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتارا ہے اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم مونہوں کو مٹا دیں اور انہیں ان کی پیٹھ پر لوٹا دیں، یا ان پر لعنت کریں جس طرح کہ ہم نے سبت والوں پر لعنت کی۔ اور اللہ کا حکم تو ہو ہی چکا ہوا ہے۔ (667)

جاتے تھے مگر بجائے اس کے کہ جو کچھ کہا جائے اس سے فائدہ اٹھائیں کبھی الفاظ کو توڑ مروڑ کر، کبھی مفہوم کو بگاڑ کر کچھ اور کا اور بیان کرتے۔ یہ تحریف کلمات ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب کوئی اچھی بات بھی سنتے خواہ وہ ان کے معتقدات کے خلاف نہ ہو تو بھی کہہ دیتے کہ ہم تمہاری بات نہیں مانتے ﴿سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا﴾ تیسرا امر یہ تھا کہ ذو معنی کلام کرتے۔ اس کی یہاں دو مثالیں دی ہیں۔ ﴿اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ اور ﴿رَاعِنَا﴾ ان تینوں قسم کی باتوں کا ذکر کر کے یعنی اول نبی کریم ﷺ کے کلام کو بگاڑنا، دوسرا بھلی بات کا انکار کر دینا، تیسرا ذو وجہین کلام کرنا۔ فرمایا کہ ﴿طَعْنًا فِي الدِّيْنِ﴾ ایسا کرتے ہیں یعنی دین اسلام میں عیب لگاتے ہوئے اور یہ ان کے نبی کریم ﷺ کو برا کہنے کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا کہ اگر اس کی بجائے وہ اچھا طریق اختیار کرتے، اچھی باتوں کو قبول کر لیتے۔ ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ اور اگر بالمقابل کوئی اپنی بات پیش کرنا چاہتے تو بجائے بددعائیہ اور طنز کے کلمات کے کہنے کے صرف اِسْمَعْ کہہ دیتے کہ ہمارے بات بھی سنیے اور جو بات سمجھ نہ آتی تھی اس کے متعلق صرف کہہ دیتے کہ ہماری رعایت کیجیے یا ہمیں مہلت دیجیے کہ ہم اس پر غور کریں۔ تو یہ ان کی بھلائی کی بات تھی اور درست طریق بھی یہی تھا۔ اور یوں ایک پر حکمت طریق سے ان کو سمجھایا ہے کہ ان کا طریق کس قدر خلاف عقل اور خلاف آداب ہے۔

667- ﴿نَّطْمِسَ وُجُوْهًا﴾ طَمْسٌ کے اصل معنی ہیں محو کر کے نشان کا دور کر دینا۔ (غ) ﴿فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ﴾ [المرسلٰت: 8:77] ''پس جب تاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔'' ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ﴾ [یونس: 88:10] ''اے ہمارے رب ان کے مالوں کو برباد کر دے۔'' ﴿وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ﴾ [یٰسٓ: 66:36] ''اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا دیں۔'' میں ان آنکھوں کی روشنی کا دور کر دینا اور آنکھوں کا محو کر دینا مراد ہے۔ (غ)

وُجُوْهٌ۔ وَجْهٌ کی جمع ہے جس کے معنی منہ بھی ہیں اور توجہ بھی اور وَجْهُ الْقَوْمِ کے معنی سردار بھی ہیں۔ [وَفُلَانٌ وَجْهُ الْقَوْمِ كَعَيْنِهِمْ وَرَأْسِهِمْ] ''اور فلاں کا چہرہ اس کی قوم کے لیے آنکھوں اور سر کی مانند ہے۔'' (غ)

پس ﴿نَّطْمِسَ وُجُوْهًا﴾ سے مراد تغیر حالت ہے۔ ایسا تغیر جو ان کو ذلیل کر دے جیسا کہ اگلے الفاظ ﴿فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ﴾ سے ظاہر ہے اور یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ ان کے سرداروں کو مٹا دیں یا ذلیل کر دیں اور یہ بھی کہ انہیں گمراہی کی طرف

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ اللہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس

لوٹا دیں۔(غ)

﴿فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ﴾ ردّ کے معنی کسی چیز کے بذاتہٖ لوٹا دینے کے یا ایک حالت سے دوسری حالت میں کر دینے کے ہیں اور اَدْبَارٌ۔ دُبُرٌ کی جمع ہے۔جس کے معنی پیٹھ ہیں۔اور مونہوں کو پیٹھوں پر پھیرنے سے مراد ہے کہ ان کی وجاہت اور اقبال کو سلب کر لیں اور ان پر ذلت اور ادبار نازل کر دیں۔(ض) اور ایک قول یہ بھی ہے [نَرُدُّهُمْ إِلٰى حَيْثُ جَاءُوْا مِنْهُ وَهِيَ أَذْرُلُمَاتِ الشَّامِ] (غق) یعنی ان کو لوٹا دیں جہاں سے وہ آئے تھے یعنی ملک شام کی طرف۔گویا بنی نضیر کی جلاوطنی کی طرف اشارہ ہے۔ایسے محاورات میں لفظوں کے پیچھے پڑنا اور یہ خیال کرنا کہ سچ مچ منہ پیٹھوں کی طرف ہو جائیں صحیح نہیں۔ آخر اسی قسم کا محاورہ یہ بھی ہے ﴿يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾[آل عمران: 149:3] ''تو وہ تم کو الٹے پاؤں لوٹا دیں گے۔'' ﴿انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾[آل عمران: 144:3] ''تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔'' جیسے وہاں محاورہ کے خاص معنی ہیں ویسے ہی یہاں ہیں۔

﴿اَصْحٰبَ السَّبْتِ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ آ چکا ہے ﴿الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ﴾[البقرة: 65:2] ''جو تم سے سبت کے معاملہ میں حد سے نکل گئے۔''

مَفْعُوْلٌ۔ فعل تاثیر کا نام ہے جو مؤثر کی طرف سے ہو اور مفعول اصل میں تو وہ ہے جو واقع ہو چکا اور یوں بھی کہا جاتا ہے [هٰذَا الْاَمْرُ مَفْعُوْلٌ] جب اس کے حصول میں کوئی شک باقی نہ رہا ہو گو وہ فی الواقع وقوع میں نہ آیا ہو۔

یہود کی سزا:

اس آیت میں یہود کو بتایا ہے کہ وہ اسی طرح عداوت اور قساوت قلبی پر اڑے رہیں گے تو ان کا انجام نہایت ہی برا ہوگا اور دو قسم کی سزا بیان کی گئی ہے۔اول ان کا ذلیل کر دینا اور اقبال کا ان سے لے کر اس کی جگہ ادبار وارد کر دینا۔دوسرے ان پر وہ لعنت وارد کرنا جو اصحاب سبت پر ہوئی تھی اور لعنت کے معنی چونکہ دور کر دینا ہیں اس لیے ایسی سزا جس میں یہ لوگ در بدر پھریں لعنت کے مفہوم میں آتی ہے۔پس مراد یہ ہے کہ یا تو ان کو عرب میں ہی ذلیل کر دیں یا یہاں سے نکال دیں اور وہ در بدر ہوتے پھریں۔چنانچہ یہ دونوں قسم کی سزا ان پر وارد ہوئی۔

بندر بننے سے مراد:

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جو سزا اصحاب سبت پر وارد ہوئی وہ بندر بن جانا نہ تھا بلکہ بندروں کی طرح ذلیل ہو کر در بدر ہونا تھا کیونکہ اس سزا کو یہاں لفظ لعنت سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے چونکہ ضروری تھا کہ وہی سزا نبی کریم ﷺ کے اعدا پر بھی وارد ہو۔ اور نبی کریم ﷺ کے اعدا بندر نہیں بنے بلکہ بندروں کی طرح تتر بتر ہوئے۔اس لیے [اِعْتِدَاءٌ فِي السَّبْتِ] کرنے والوں کے بندر بننے سے بھی ان کا در بدر ہونا مراد ہے۔

مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

کے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے وہ ایک بھاری گناہ افترا کرتا ہے۔ (668)

668- **شرک کی اقسام:** یہود کے ذکر میں شرک کا ذکر اس مناسبت سے ہے کہ یہودی بھی شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ قریش سے ساز باز کے لیے بتوں تک کو سجدہ کر دینے سے پرہیز نہ کیا جیسا آگے مفصل ذکر آتا ہے۔ اور دوسرے اس لیے کہ اصل غرض مسلمانوں کو پاکیزگی کی راہیں بتانا تھا تو ان کو سمجھایا ہے کہ شرک سب بدیوں کی جڑ ہے، جس طرح توحید سب نیکیوں کی جڑ ہے، اس سے سخت اجتناب کریں۔ شرک کیا چیز ہے؟ صرف بتوں یا چاند، سورج، ستاروں، ہواؤں وغیرہ کا پوجنا ہی شرک نہیں بلکہ یہ شرک کی وہ موٹی قسم ہے جس میں بت پرست اور عناصر پرست قومیں گرفتار ہیں۔ اور نہ صرف یہی شرک ہے کہ کسی انسان کو فی الواقع خدا سمجھا جائے۔ جیسے ہندو کرشن یا رامچندر کو یا عیسائی مسیح کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک بڑا شرک جو اس وقت مسلمانوں میں پھیل رہا ہے وہ پیر پرستی یا علما پرستی کا شرک ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ عدی بن حاتم (جو اس واقعہ کے وقت نصرانی تھے) رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تو آپ سورۃ توبہ پڑھ رہے تھے۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبة: 31:9] تو عدی نے کہا: ہم ان کی عبادت نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ ٹھیک نہیں کہ جو چیز خدا نے حلال کی ہے وہ اسے حرام ٹھہراتے ہیں تو تم بھی حرام ٹھہراتے ہو۔ اور جو چیز خدا نے حرام کی ہے وہ اسے حلال بتاتے ہیں تو تم بھی حلال سمجھتے ہو؟'' اس نے کہا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہی ان کی عبادت ہے۔'' گویا علماء اور پیروں اور سجادہ نشینوں کے اقوال کو جو کتاب اللہ کے خلاف ہوں بغیر سوچے سمجھے قبول کرتے جانا یہ بھی ایک شرک ہے اور یہ جو بعض مرید اپنے پیروں اور سجادہ نشینوں کے متعلق ایسے اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ ان کے پیر کہتے یا کرتے ہیں بس وہی حق ہے اور کتاب اللہ کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے۔ جیسا کہ اکثر مسلمانوں کی حالت اس زمانہ میں ہے۔ یہ وہی شرک ہے جس کا ذکر ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبة:31:9] ''انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوائے رب بنالیا ہے۔'' میں ہے اور اس شرک نے مسلمانوں کو بالکل ذلیل کر دیا ہے۔ پھر اپنے پیروں کی دعاؤں پر اعتماد بھی شرک کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ ہر ایک گروہ اپنے اپنے پیر کے متعلق یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کی دعا سے یا توجہ سے ہماری مصائب ٹل جاتی ہیں۔ اس شرک میں اور اُس بت پرست کے اعتقاد میں جو سمجھتا ہے کہ بت کی عبادت سے میری مصیبت ٹل جاتی ہے بہت کم فرق ہے۔ یہ تو ظاہر قسمیں شرک کی ہیں۔ قرآن کریم نے ایک اور قسم کے شرک کا بھی ذکر فرمایا ہے یعنی اپنی خواہشات کی پیروی کو بھی شرک قرار دیا ہے ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ [الفرقان: 43:25] ''کیا تو نے اسے دیکھا ہے جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے۔'' پھر بعض اس سے بھی باریک قسم کے شرک ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ کیا تو نے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جو اپنے

شرک کے نہ بخشنے کی وجہ:

شرک کو کیوں ایسا خطرناک جرم قرار دیا ہے؟ کیا خدا کی شان اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے میں کچھ کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ ایسا ناراض ہو جاتا ہے کہ بخشتا ہی نہیں؟ اگر ساری دنیا بھی خدا کے ساتھ شریک بنائے تو اس سے اس کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی اور اگر ساری دنیا موحد ہو جائے تو اس سے خدا کی شان بڑھ نہیں جاتی۔ بات یہ ہے کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہرا کر انسان اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا۔ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ صفات دیں۔ اس کو بتا دیا کہ اس عالم کی ساری طاقتیں اور ساری چیزیں ہم نے تیرے لیے مسخر کر دی ہیں۔ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثية: 13:45] ''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (فضل سے) تمہارے کام پر لگایا۔'' پس اس کو سب مخلوقات سے اشرف بنایا۔ پھر بایں اگر وہ بتوں کے آگے یا عناصر کے آگے یا سورج چاند کے آگے یا خود اپنے بھائی انسان کے آگے عبودیت کی ذلت اختیار کرتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو اس اعلیٰ مرتبہ سے نیچے گرا دیتا ہے۔ پس خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا درحقیقت انسانیت کو ذلیل کرنا اور اس شرف کو چھوڑنا ہے جو خدا نے انسان کو دیا ہے۔ اس لیے یہ سب سے خطرناک جرم ہے۔

شرک کی سزا:

نہ بخشنے سے مراد کیا ہے؟ صرف یہ کہ ضروری ہے کہ انسان اس جرم کی سزا پائے۔ اس کے سوا جتنے گناہ ہیں ان کو خدا چاہے تو بغیر سزا دیئے معاف کر دے۔ لیکن شرک کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہ حکم لگانا کہ شرک کی سزا کتنی بڑی ہوتی ہے، ہمارا کام نہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ سزا کی اصل غرض انسان کو ان آلائشوں سے پاک کرنا ہے جو خود اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے اندر پیدا کر لی ہیں۔ اس لیے ہم یہ مانتے ہیں کہ جب یہ غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ سزا بھی اٹھ جاتی ہے۔ اگر ایک مسلمان کے شرک کی سزا کبھی ختم ہو سکتی ہے تو ایک غیر مسلم کے شرک کی سزا بھی منقطع ہو سکتی ہے۔ صرف مراتب ہیں ایک زیادہ خطرناک شرک میں گرفتار ہے اور اس کا شرک اس کی توحید پر غالب ہے۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہے جو خدا کے ساتھ اعتقاداً شریک مانتے ہیں۔ جیسے بت پرست، مسیح پرست۔ کیونکہ ان کے عقائد کی بنیاد ہی شرک پر ہے۔ ایک وہ ہیں جن کے اعتقاد کی بنا تو توحید الٰہی پر ہے۔ مگر غلطی میں پڑ کر وہ قبروں یا پیروں سے اپنی حاجات مانگتے ہیں یا ان کو ایسا مرتبہ دیتے ہیں کہ عملاً وہ خدا کے احکام کی پروا اپنے پیروں کے احکام کے خلاف نہیں کرتے۔ ان کی چونکہ بنیاد درست ہے، اس لیے ان کا شرک اس خطرناک حد تک نہیں پہنچتا جیسے پہلوں کا۔ آریہ سماج کا شرک بھی قسم اول میں ہی آتا ہے کیونکہ وہ خدا کی صفات میں دو اور چیزوں کو کامل طور پر شریک مانتے ہیں۔

شرک سے توبہ:

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص توبہ کرتا ہے وہ چونکہ اپنی اصلاح اسی زندگی میں کر لیتا ہے اس لیے اس کا گناہ خواہ شرک بھی ہو

بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

آپ کو پاکیزہ ظاہر کرتے ہیں بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔(669)

معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح کر لے۔ اس آیت کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ کسی گناہ پر بغیر توبہ یعنی رجوع کے انسان مر جائے تو اگر وہ گناہ شرک ہے تو اس کی سزا ضرور پائے گا۔ دوسرے گناہوں کو خدا چاہے تو بالکل بخش دے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے [مَنْ قَالَ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ] (جامع الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء فيمن يموت وهو يشهد أن لا إله إلا الله: 2638) اور یہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے کہ توبہ سے شرک بھی بخشا جاتا ہے۔ اور شرک کو افترا اس لیے کہا کہ اس کو لوگوں نے انبیاء علیہم السلام اور راستبازوں کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ کسی نبی یا کسی راستباز انسان نے کبھی شرک کی تعلیم نہیں دی۔ پس یہ لوگوں کا افترا ہے۔

669- يُزَكُّوْنَ۔ [دیکھو نمبر: 66 و 164]۔ انسان کا اپنے **نفس کا تزکیہ دو طور پر ہے**۔ ایک فعل کے ساتھ یعنی اچھے کام کر کے انسان اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرے اور یہ وہ تزکیہ ہے جس کے حصول کے لیے قرآن کریم نے بار بار ہدایت فرمائی ہے۔ جیسے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝﴾ [الشمس: 9:91] ''وہ کامیاب ہوا جس نے اسے پاک کیا'' میں اور دوسرا قول کے ساتھ یعنی انسان اپنے منہ سے اپنے آپ کو پاک کہے اور اس سے منع کیا ہے کیونکہ اس سے انسان کے نفس کے اندر کبر پیدا ہوتا ہے۔ (غ)

فَتِيْلًا۔ فَتَلَ اصل میں رسہ کے بٹنے کو کہتے ہیں۔ اور فتیل وہ ہے جسے تم اپنی انگلیوں میں ملتے ہو جیسے دھاگا یا میل اور بطور مثال حقیر شے پر بولا جاتا ہے۔ اور فَتِيْلٌ اس کو بھی کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی شق میں ہوتا ہے۔ (غ)

مسلمانوں میں پیر پرستی کی بیماری:

اصل ذکر یہود کا تھا اور انہی کو توجہ دلانے کے لیے شرک جیسے ظلم عظیم پر توجہ دلائی تھی مگر چونکہ ان کا شرک خاص قسم کا تھا اس لیے اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے اور وہ شرک وہی تھا جس کا ذکر اوپر بھی ہو چکا کہ وہ اپنے راہبوں اور پیروں کے دعویٰ بزرگی پر ایسے فریفتہ ہوتے تھے کہ جو کچھ وہ کہہ دیں اسی کو خدا کا حکم سمجھ لیتے تھے۔ شرک کے ذکر کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں، صاف بتاتا ہے کہ یہ ان علماء اور پیروں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں اس لیے کہ وہ اتفاق سے دوسروں کے مرشد بن گئے ہیں۔ پس یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچ کر مسلمانوں کو پیر پرستی کے خطرناک مرض سے ڈرایا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو اس پیر پرستی کی بیماری نے بت پرستی کی طرح عوام کو كَالْاَنْعَامِ بنا دیا ہے۔ وہ بے چارے اپنی عقل و فکر سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہے۔ جو کچھ پیر نے کہہ دیا وہی حق ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰ ع 7/8/4

دیکھ کس طرح اللہ پر جھوٹ بناتے ہیں۔ اور یہی کھلا گناہ کافی ہے۔ (670)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝۵۱

کیا تو نے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ سحر اور کاہنوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے بارے میں جو کافر ہوئے کہتے ہیں یہ ان کی نسبت جو ایمان لائے زیادہ سیدھی راہ پر ہیں۔ (671)

ہے کہ یہ آیت تَمَادُحٌ یعنی ایک دوسرے کی مدح کرنے اور ایک دوسرے کو پاک کہنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ایک دوسرے کی مدح کرنے کی ممانعت:

اور احادیث میں ایسی باتوں سے بہت ڈرایا ہے۔ مگر افسوس کہ یہی آج کل کی پیر پرستی کی بنیاد ہے۔ مسند احمد میں مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا [اَنْ نَحْثُوَ فِيْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِيْنَ التُّرَابَ] (مسند احمد، جلد52، صفحہ143، :24553) کہ ''ہم مدح کرنے والے کے منہ پر مٹی پھینکیں۔'' اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی بڑی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [وَيْحَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ] (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب مَا يُكْرَهُ مِنَ التَّمَادُحِ:6061) ''تجھ پر افسوس تو نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔'' پھر فرمایا: ''اگر اپنے دوست کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہا کرو کہ میں اسے ایسا سمجھتا ہوں۔''

670- ﴿وَ كَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ ان کا یہ دعویٰ کہ ہم پاک اور برگزیدہ ہیں یہی ان کا کافی گناہ ہے۔ ﴿اِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ اس لیے کہا کہ ہر ایک شخص جان سکتا ہے کہ ایسا دعویٰ ایک متکبرانہ دعویٰ ہے اور کسی شخص کو سزاوار نہیں کہ ایسا دعویٰ کرے اور ﴿كَفٰى بِهٖٓ﴾ اس لیے فرمایا کہ یہ تو پاک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اور کوئی امر ان کے گنہگار ہونے پر شاہد نہ بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی گناہ کافی تھا کہ وہ ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔

671- اَلْجِبْتِ۔ جِبْتٌ اور جِبْسٌ کے معنی ہیں دھون دھان جس میں کوئی بھلائی نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ تا اس میں س سے بدل ہے اور ہر ایک چیز جو اللہ کے سوائے پوجی جائے اسے جِبْتٌ کہا جاتا ہے اور ساحر اور کاہن کو بھی جِبْتٌ کہا گیا ہے۔ (غ) اور حدیث میں آتا ہے: [أَنَّ الْعِيَافَةَ، وَالطَّرْقَ، وَالطِّيَرَةَ مِنَ الْجِبْتِ] یعنی ''پرندوں کا زجر اور زمین پر خط لگانا اور فال یہ سب کچھ جِبْتٌ سے ہے۔'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بخاری میں منقول ہے کہ [اَلْجِبْتُ السِّحْرُ] یعنی جبت سحر ہے۔

طاغوت کے معنی [نمبر: 331] میں بیان ہو چکے ہیں۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے متعلق روایت ہے کہ ان سے طاغوت کے متعلق

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾

یہی وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تُو اس کے لیے کوئی مددگار نہ پائے گا۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾

کیا ان کے لیے بادشاہت سے کچھ حصہ ہے؟ تو پھر وہ لوگوں کو تل برابر بھی نہ دیں گے۔ (672)

سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا [هُمْ كُهَّانٌ يَنْزِلُ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ] (صحيح البخاری، التفسير، باب قوله: وإن كنتم مرضى...) یہ کاہن ہیں جن پر شیطان اترتے ہیں۔ اور اسی میں یہ بھی ہے کہ ہر ایک قبیلہ میں ایک کاہن تھا جس سے وہ فیصلہ کراتے تھے اور مجاہد کا قول منقول ہے [اَلطَّاغُوْتُ الشَّيْطَانُ فِيْ صُوْرَةِ اِنْسَانٍ] طاغوت شیطان ہے جو صورت انسان میں ہو۔ جس سے فیصلہ کراتے ہیں اور وہ ان کا حاکم ہے۔ (ث)

یہودیت پر عرب کی بت پرستی کا اثر:

اس رکوع میں یہود کے ہی مزید حالات مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح حق سے انحراف کرتے کرتے ان کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ صریح کفر پر مائل ہو گئے۔ چنانچہ اس آیت میں ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ﴾ کہہ کر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت عرب میں رہ کر عربوں کی بت پرستی اور کہانت پر یہودیوں کا بھی اعتقاد ہو گیا تھا۔ اور یہ حال ہر قوم کا ہوتا ہے جو حق کے پھیلانے پر زور نہیں لگاتی کہ وہ آہستہ آہستہ دوسروں کے اثر کے نیچے آنا شروع ہوتی ہے۔ وہ یہودی جو عرب میں توحید کا پیغام لے کر آئے تھے بجائے اس کے کہ بت پرستوں کو توحید کی طرف لاتے خود بت پرستی اور کہانت پر گر گئے۔ اس کی مثال مسلمانوں میں بھی ملتی ہے۔ جب تک وہ دوسروں کو توحید کا پیغام پہنچانے پر زور لگاتے تھے ان کے خیالات ہندوؤں میں اثر کرتے چلے گئے۔ مگر جب انہوں نے اس کو ترک کر دیا تو **ہندوؤں کے بہت سے خیالات ان میں مروج ہو گئے**۔ حتیٰ کہ بعض صوفیوں کے گروہ ایسے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کی دعاؤں اور وظیفوں کو لے لیا ہے اور ہندوؤں کے رسم و رواج تو بہت سے مسلمانوں میں آ گئے ہیں۔ یہ پیر پرستی اور قبر پرستی جو مسلمانوں کے اندر پائی جاتی ہے وہ بھی درحقیقت بت پرستی کا ہی ایک رنگ ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب کعب ابن اشرف اور حیی بن اخطب قریش کو نبی کریم ﷺ کے خلاف اکسانے کے لیے مکہ میں آئے اور خود بھی ان کی مدد کا وعدہ کیا تو قریش نے کہا کہ ہم تم پر اعتبار نہیں کر سکتے جب تک کہ تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو، تو انہوں نے سجدہ کیا اور کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا بتاتا ہے کہ وہ بت پرستوں کو مسلمان موحدین سے اچھا سمجھتے تھے اور روایات میں صریحاً ان کا ایسا کہنا بھی مذکور ہے۔

672- نَقِيْرٌ۔ نَقَرَ کے اصل معنی کریدنا ہیں۔ چنانچہ مِنْقَارٌ جانور کی چونچ کو کہتے ہیں جس سے وہ کریدتا ہے اور اس لوہے کو بھی کہتے ہیں

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

بلکہ وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے سو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی بادشاہت دی ہے۔ (673)

جس کے ساتھ چکی راہی جاتی ہے۔ اسی سے نَقِیْرٌ کھجور کی گٹھلی میں جو ننھا سا گڑھا ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں اور بطور مثل نہایت خفیف شے پر بولا جاتا ہے جیسے ہماری زبان میں تل، رائی وغیرہ۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر اس وجہ سے حسد کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل سے ہے اور کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے ہونا چاہیے۔ مگر ان کے اخلاق تو اس قدر ذلیل ہو چکے ہیں کہ یہ اب بادشاہت کے قابل بھی نہیں رہے۔ نبوت تو بہت بڑا انعام ہے اور اس کے لیے بہت ہی بڑا دل بھی چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ بادشاہت سے ان کے پاس کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس ہوتا تو وہ اس قدر بخیل ہیں کہ دوسروں کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہت کے لیے بھی ایک وسیع دل چاہیے۔ بخل اور بادشاہت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مگر نبوت کے لیے اس سے بھی وسیع دل چاہیے۔ مسلمانوں کو چونکہ نبی کریم ﷺ کا وارث بنایا گیا ہے گویا اب علوم نبوت ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرۃ: 143:2] ''تاکہ تم لوگوں کے پیشرو بنو'' کے ماتحت اسی سرچشمہ سے ملتے ہیں۔ اس لیے ان کو اپنے اخلاق انبیاء کی طرح وسیع کرنے چاہئیں۔

673- یہاں آل ابراہیم کو یعنی **مسلمانوں کو دو چیزیں دینے کا ذکر کیا۔ کتاب اور حکمت اور ملک عظیم**۔ کتاب اور حکمت میں تو نبوت کا ذکر کیا ہے کیونکہ یہی دونوں چیزیں غرض و غایت نبوت ہیں اور نبوت کی عظمت کی وجہ سے مقدم اسی کو کیا ہے اور پھر ایک عظیم الشان بادشاہت کے دینے کا ذکر کیا۔ حالانکہ ابھی مسلمانوں کو بادشاہت تو ملی نہ تھی۔ اور اگر تھی بھی تو مدینہ کی دیواروں کے اندر اور وہاں بھی ابھی یہودی مخالف، کچھ مشرک موجود اور کچھ منافق۔ پس ملک عظیم میں اسلام کی آئندہ بادشاہت کا وعدہ تھا جو تھوڑے ہی سالوں میں دنیا کے کثیر حصہ میں پھیل گئی۔ اس وعدہ میں اہل کتاب کو یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ تم جس قدر چاہو ان کی مخالفت کر لو ان کو اللہ تعالیٰ اب عظیم الشان بادشاہت دنیا میں دینے والا ہے اور جس طرح وہ کتاب و حکمت جو مسلمانوں کو دی گئی اب ان سے چھن نہیں سکتی کیونکہ ان کا نبی تا قیامت زندہ ہے۔ اسی طرح وہ بادشاہت بھی کبھی مسلمانوں سے چھن نہیں سکتی۔ ہاں اپنی سستی اور غفلت سے عارضی طور پر اس میں کمزوری آ سکتی ہے اور یہاں بجائے مسلمانوں کے آل ابراہیم اس لیے کہا کہ یہ وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھا اور یوں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مسلمان بھی اسی ابراہیم علیہ السلام کی آل ہیں جس کی آل بنی اسرائیل تھے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

پس بعض اُن میں سے وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو اس سے رکتے ہیں، اور دوزخ جلانے کو کافی ہے۔ (674)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾

جو لوگ ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں ہم ان کو عنقریب آگ میں داخل کریں گے۔ جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کی جگہ ان کو اور کھالیں دے دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھیں۔ بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (675)

674- ﴿اٰمَنَ بِهٖ﴾ اس سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان ہے جیسا کہ امام مجاہد سے مروی ہے اور ﴿صَدَّ عَنْهُ﴾ میں وہ لوگ داخل ہیں جو خود اسلام میں آنے سے رکتے تھے یا دوسروں کو روکتے تھے۔ اگلی آیت اس کو بالکل صاف کر دیتی ہے کہ یہاں ایمان اور انکار محمد رسول اللہ ﷺ کا ہی مراد ہے۔

675- نَضِجَتْ۔ نَضَجَ گوشت کے ہانڈی میں یا کباب کے طور پر پک جانے پر بھی بولا جاتا ہے اور پھل وغیرہ کے پکنے پر بھی اور نَضِيْجُ الرَّأْيِ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی رائے محکم ہو۔

جُلُوْدٌ۔ جِلْدٌ کی جمع ہے اور بدن کے چھلکے یعنی چمڑے کو جلد کہا جاتا ہے۔ مگر بعض وقت مراد بدن بھی لے لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ [الزمر: 23:39] ''اس سے ان لوگوں کے بدن کانپ اٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔'' جہاں جلود سے مراد ابدان ہیں۔ (غ)

چمڑوں کے پک جانے اور ان کے بدلنے سے کیا مراد ہے؟

جس طرح نعمائے جنت کی حقیقت کو اس دنیا میں کوئی نہیں جان سکتا اسی طرح آلام نار کی حقیقت کو بھی کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن ایسے الفاظ میں قرآن شریف نے ان امور کو بیان کیا ہے جو انسان کے ذہن کے قریب ان باتوں کو کر دیں۔ انسانی تجربہ میں یہ ہے کہ جب ایک جگہ دکھ سے پک جاتی ہے تو پھر اس کو کوئی دکھ محسوس نہیں ہوتا۔ پس یہ سمجھانے کے لیے کہ جو صورت اس دنیا میں ہو سکتی ہے کہ ایک چیز جل کر اس حالت پختگی کو پہنچ جائے کہ پھر اس پر آگ سے کوئی تکلیف وارد نہ ہو وہ صورت وہاں نہ ہوگی۔ یہ محاورہ اختیار کیا ہے بعض نے یہاں تک بھی کہہ دیا ہے: [اَلْمُرَادُ، اَلدَّوَامُ وَعَدَمُ الْاِنْقِطَاعِ وَلَا نَضَجَ وَلَا احْتِرَاقَ] (غق) اور قرآن کریم نے خود اس پکنے اور اس تبدیلی کی غرض ﴿لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ بتائی ہے۔ یعنی تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔ ایسا نہیں ہوگا کہ اس طرح عذاب کے عادی ہو جائیں گے کہ وہ عذاب ان کو پھر محسوس ہونے سے رہ جائے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے ان کو باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ انہی میں رہیں گے۔ ان کے لیے ان میں پاک ساتھی ہوں گے اور ہم انہیں گھنے سایوں میں داخل کریں گے۔ (676)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ بے شک یہ بہت ہی عمدہ بات ہے جس کی تمہیں اللہ نصیحت کرتا ہے اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ (677)

676- ﴿ظِلًّا ظَلِيْلًا﴾ مفردات میں ہے کہ ظِلٌّ ضَحٌّ یعنی دھوپ کی ضد ہے اور وہ فئے سے عام ہے کیونکہ ظِلُّ اللَّيْلِ اور ظِلُّ الْجَنَّةِ کہا جاسکتا ہے۔ ہر مقام کو جہاں سورج نہ پہنچے ظل کہا جاتا ہے اور فئے صرف اسی کو کہا جاتا ہے کہ جس سے سورج پہنچ کر ہٹ گیا ہو۔ اور ظل سے مراد عزت اور حفاظت اور آسائش لی جاتی ہے اور ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ﴾ [المرسلٰت: 41:77] ''متقی سایوں میں ہیں۔'' میں ظِلٰلٍ کے معنی عزت اور حفاظت ہیں۔ ﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا﴾ [الرعد: 35:13] ''اس کے پھل ہمیشہ رہیں گے اور اس کی آسائش (بھی)۔'' ﴿هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ﴾ [یٰسٓ: 56:36] ''وہ اور ان کے جوڑے سایوں میں ہوں گے۔'' اور عام محاورہ میں اَظَلَّنِيْ فُلَانٌ کے معنی دیئے ہیں میری نگہداشت کی اور مجھے اپنے ظل میں اور اپنی عزت (یعنی روک میں) اور اپنی حفاظت میں لے لیا اور یہاں ﴿ظِلًّا ظَلِيْلًا﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ خوش زندگی سے کنایہ ہے۔ اور لسان العرب میں ہے کہ ظل سورج کی شعاع کی روشنی ہے اور اس کی شعاع کو الگ کر کے۔ کیونکہ اگر روشنی نہ ہو تو ظل نہیں بلکہ ظلمت کہیں گے اور ظَلِيْلٌ ظَلَّ سے تاکید کے لیے صفت مشتق ہے اور **ظل اللہ** حدیث میں بادشاہ کے لیے آیا ہے۔ اور یہاں فی الحقیقت سایہ مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ خدا کی ذات اس سے پاک ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے [سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ] (صحيح البخاري، كتاب10، باب36،: 660) اور دوسری میں اسی جگہ [فِيْ ظُلَلِ الْعَرْشِ] ہے اور یہاں بھی سایہ معنی نہیں ہوسکتے۔ جب آیات اللہ کے انکار کرنے والوں اور ان کی سزا کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ ہی جیسا کہ قرآن کریم کی عادت ہے، ایمان اور اعمال صالحہ والوں کا ذکر بھی کیا۔

677- الْاَمٰنٰتِ۔ اَمَانَةٌ کی جمع ہے اور اَمَانَةٌ اور اَمَانٌ۔ اَمِنٌ سے مصدر ہے اور مفردات میں ہے کہ کبھی تو اَمَانٌ اس حالت کا نام ہوتا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو پھر اگر

ہے جس پر انسان امن میں ہو اور کبھی اس چیز کا نام ہوتا ہے جس پر انسان کو امین بنایا جائے۔ جیسا ﴿تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ﴾ [الأنفال: 27:8] ''(نہ) اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔'' میں اَمَانَاتٌ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر تم کو امین بنایا گیا ہے۔ اور ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ﴾ [الأحزاب: 72:33] ''ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا۔'' میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے امانت کے معنی فرائض مروی ہیں۔ (ل) اور نہایہ میں ہے کہ امانت کا لفظ طاعت اور عبادت اور ودیعت اور ثقہ اور امان پر بولا جاتا ہے اور ان میں سے ہر معنی میں حدیث آئی ہے۔

اس آیت میں بظاہر ایک نیا مضمون نظر آتا ہے۔ ابھی یہودیوں کی بے اعتدالی کا ذکر تھا، **اب امانتوں کے ادا کرنے کا ذکر شروع ہوگیا۔** اور اسی آیت میں ایک تیسرا مضمون یہ شروع کر دیا گیا کہ لوگوں کے درمیان فیصلے عدل و انصاف سے کیا کرو۔ مگر فی الحقیقت ان تینوں مضمونوں میں ایک نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہودیوں کی بے اعتدالیوں کے ذکر میں اصل منشا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کا تھا۔ یہودیوں کی بے اعتدالیاں کیا تھیں اور کس بات کا نتیجہ تھیں؟ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں، اس کی عبادت سے انحراف اس کی ودیعت کی ہوئی طاقتوں کو غیر محل پر استعمال کرنا اور یہ درحقیقت امانت میں خیانت تھی۔ کیونکہ امانت کے اصل معنی اطاعت اور عبادت اور ودیعت وغیرہ ہی ہیں۔ یہود نے خدا کی امانتوں کو ضائع کیا، اس کی نافرمانی کی، اس کی بتائی ہوئی راہوں سے الگ ہو گئے، اس کی دی ہوئی طاقتوں سے ٹھیک کام نہ لیا۔ پس مسلمانوں کو یہ حکم دینے میں کہ تم امانتوں میں خیانت نہ کرنا گویا اصل مضمون کی طرف اور یہودیوں کے ذکر کے اصل مقصود کی طرف رجوع کیا ہے۔ پس جو حکم ادائے امانت کا یہاں ہے اس میں اگر امانت مال داخل ہے تو اصلی امانت یعنی اللہ کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت کو ٹھیک طور پر لگانا بھی شامل ہے۔ اور ﴿اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ انسان کی نیکی کا اصل معیار دوسرے انسانوں سے تعلقات میں پورا اترنا ہے۔ جو شخص اس معیار پر پورا نہیں اترتا اس کی نیکی برائے نام نیکی ہے۔ پس ہر انسان کو اس کا حق دینا اور اپنی ذمہ داری کو اس کے بارہ میں پورا کرنا فی الحقیقت ادائے امانت ﴿اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ہے۔ ایسا ہی ہم پیشوا بنائیں گے۔ تو ان لوگوں کو جو پیشوا بننے کے اہل ہیں حاکم بنائیں۔ تو ان لوگوں کو جو حکومت کے اہل ہیں یہ سب کچھ ادائے امانت ہے۔ ایک تسبیح خواں زاہد کو اگر فوج کی سپہ سالاری دے دی جائے تو یہ ادائے امانت ﴿اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ نہیں۔ ایک گوشہ نشین دنیا سے ناواقف کو اگر حاکم بنایا جائے تو یہ ادائے امانت ﴿اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ نہیں۔

حاکم و محکوم کے تعلقات:

لیکن انسان کا تعلق انسان سے ایک تو مساوات کی حیثیت میں ہے یعنی ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے دوسرے پر کچھ حقوق اور دوسرے کے متعلق کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے۔ خاوند اور بی بی، آقا اور نوکر، بھائی اور اجنبی، قریبی اور ہمسائے، ایک

تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ ع 8 9 5

کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو۔ یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔ (678)

شہر اور ایک ملک کے رہنے والے، ایک قوم کے افراد اور مختلف قوموں کے افراد یہ سب مساوات کی حیثیت میں ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہی تعلقات انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہیں۔ لیکن ایک اور قسم کے تعلقات بھی تمدن انسانی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہو گئے ہیں اور وہ ہیں حاکم و محکوم کے تعلقات۔ پس جب ادائے امانت ﴿اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ کا ذکر کیا جس میں پیشتر تعلقات انسانی کا ذکر آ گیا تو ایک خاص صورت حاکم و محکوم کے تعلقات کو بھی بتا دیا۔ حاکم کا کیا فرض ہے یہاں بتایا ہے، محکوم کا کیا فرض ہے اس سے اگلی آیت میں بتایا۔ چنانچہ یہاں فرمایا کہ جب تم کو لوگوں پر حاکم مقرر کیا جائے اور تم کو لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے ہوں تو اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ عدل کے ساتھ فیصلے کرو۔ یہاں اَلنَّاسُ کا لفظ وسیع اختیار فرمایا ہے۔ مسلمان ہوں یا ہندو یا عیسائی فیصلہ میں عدل ملحوظ ہونا چاہیے اور کسی خاص قوم کی طرف جھکنا نہیں چاہیے۔

مفسرین نے عموماً اس آیت کی شان نزول میں **عثمان بن ابی طلحہ** کا قصہ لکھا ہے جس کے پاس خانہ کعبہ کی چابی تھی۔ یعنی وہ خانہ کعبہ کا حاجب یا محافظ تھا۔ کہ اول اس نے نبی کریم ﷺ کو فتح مکہ کے دن چابی دینے سے انکار کیا بعد میں جب اس سے لے لی گئی تو سیدنا عباس رضی اللہ عنہ (یا علی رضی اللہ عنہ) نے چاہا کہ حاجب کا عہدہ بھی سقایہ (یعنی حاجیوں کو پانی پلانے) کے ساتھ جمع کر دیا جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے چابی واپس عثمان کو دی اور اسی کے خاندان میں یہ آج تک ہے۔ لیکن اگر فی الواقع نزول آیت اس موقع پر بھی ہوا ہو تو حکم اس کا پھر بھی عام ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے اعتراف کیا ہے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک عثمان بن ابی طلحہ مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس سے نبی کریم ﷺ کی دریا دلی کا اندازہ کرو۔

678- ﴿اُولِي الْاَمْرِ﴾۔ اَمَرْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے مکلف کیا کہ وہ کچھ کرے۔ پس امر بمعنی حکم ہے اور اولی الامر سے مراد بعض کے نزدیک وہ امیر ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مقرر کیے گئے اور بعض کہتے ہیں کہ اہل بیت کے آئمہ مراد ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ امر بالمعروف کرنے والے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ فقہاء اور اہل دین مراد ہیں۔ یہ سب اقوال امام راغب رحمہ اللہ نے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ سب اولی الامر کے اندر داخل ہیں۔ کیونکہ اولی الامر جن کی وجہ سے لوگ رکتے ہیں چار قسم ہیں۔ یعنی:

① انبیاء علیہم السلام اور ان کا حکم عام اور خاص لوگوں کے ظاہر و باطن پر ہے۔

② اور والی یعنی بادشاہ اور ان کا حکم سب کے ظاہر پر ہے اور نہ ان کے باطن پر۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

کیا تو نے ان (کی حالت) پر غور نہیں کیا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا

---

③ اور اہل حکمت یا فلسفی جن کا حکم خاص لوگوں کے باطن پر ہے۔

④ اور واعظ اور ان کا حکم عام لوگوں کے باطن پر ہے نہ ان کے ظاہر پر۔

اولی الامر کا حکم کس حد تک مانا جا سکتا ہے:

پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ باہمی تعلقات میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرو جو حاکم ہیں وہ محکوم کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں۔ اب بتایا ہے کہ محکوم کا تعلق حاکم سے کیسا ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے بتایا ہے کہ حقیقی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے یعنی اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے حکموں کا پابند کر دینا ان دو کے حکم کی فرمانبرداری بلا قید ہے۔ لیکن ان کے ساتھ جو تیسرا حکم ہے کہ اولی الامر کی فرمانبرداری کرو اس کے ساتھ صاف قید لگا دی کہ اگر کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولوالامر کی فرمانبرداری کا اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی طرح مطلق اور بلا قید حکم نہیں بلکہ یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ گویا اللہ اور رسول کا حکم ایک ذیل میں ہے، اولوالامر کا حکم دوسری ذیل میں۔ اللہ اور رسول حکم دینے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ نہ رسول کا حکم اللہ کے حکم کے خلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اولوالامر حکم دینے میں غلطی کر سکتے ہیں اور اولوالامر کا حکم اللہ یا رسول کے حکم کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ پس اللہ اور رسول کے حکم کی ہر حال میں اطاعت کرنی ہوگی۔ اولوالامر کے حکم کی بھی عموماً اطاعت کرنی ہوگی۔ لیکن اگر وہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف ہو تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی ہوگی۔

احادیث اس بارہ میں کثرت سے ہیں۔ بخاری اور دیگر کتب احادیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا اور اس پر ایک انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ راستہ میں امیر کو اپنے ساتھیوں پر کچھ غصہ آیا اور اس نے کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو حکم نہیں دیا کہ میری اطاعت کرو؟ انہوں نے کہا بے شک دیا ہے پھر اس نے آگ جلوائی اور کہا میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اس کے اندر داخل ہو جاؤ۔ ایک نوجوان نے کہا ہم تو آگ سے بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف آئے ہیں۔ پس جلدی مت کرو یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ سے ملو۔ چنانچہ جب واپس آئے تو یہ واقعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا اگر تم اس میں داخل ہو جاتے تو پھر نہ نکلتے [إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ] (صحيح البخارى، كتاب الأحكام، باب السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ لِلإِمَامِ مَا لَمْ تَكُنْ مَعْصِيَةً: 7145) **''اطاعت (یعنی اولی الامر کی اطاعت) صرف معروف بات میں ہے۔''** یعنی اس بات میں جو خلاف شریعت نہ ہو۔ اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا [السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ.] (صحيح البخارى، كتاب الأحكام، باب السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ لِلإِمَامِ مَا لَمْ تَكُنْ مَعْصِيَةً:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا' وہ چاہتے ہیں کہ شیطان سے

7144) ''مسلمان شخص پر واجب ہے کہ وہ قبول کرے اور فرمانبرداری کرے خواہ ایک بات کو پسند کرے یا اسے ناپسند کرے جب تک کہ اسے (اللہ اور رسول ﷺ کی) نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا۔ لیکن اگر (اللہ اور رسول ﷺ کی) نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر قبول کرنا نہیں اور نہ اطاعت کرنا ہے۔'' اور بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قبول کرو اور اطاعت کرو خواہ تم پر حبشی غلام کو امیر بنایا جائے۔'' اور صحیحین میں ہے کہ ''جو شخص اپنے امیر سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے چاہیے کہ صبر کرے۔ کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر ہٹتا ہے پھر مرتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔''

ان احادیث سے ظاہر ہے کہ اولی الامر کے احکام کی پابندی کی اصل بنیاد اتحاد جماعت ہے کیونکہ جب تک سب اپنے آپ کو ایک حکم کے ماتحت نہیں کرتے اس وقت تک اتحاد قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اگر امیر کوئی ایسا حکم دے جس کو ایک شخص ناپسند کرتا ہے تو بھی اسے ماننا چاہیے بشرطیکہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر خلاف ہو تو اس صورت میں امیر کے حکم کی اطاعت نہ کی جائے۔ ﴿اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ میں جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہے انبیاء، علماء، آئمہ دین، بادشاہ، حکام سب شامل ہیں۔ مگر چونکہ خطاب ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ کو ہے اس لیے مِنْكُمْ کی قید سے صاف نظر آتا ہے کہ یہاں مراد مسلمان حکام ہی ہیں۔ ہاں یہ سوال علیحدہ ہے کہ آیا اگر کسی جگہ مسلمان غیر مسلم بادشاہ کے ماتحت ہوں تو اس کے احکام کی اطاعت کریں یا نہ بشرطیکہ وہ احکام خلاف قرآن وحدیث نہ ہوں۔ اس کے لیے نبی کریم ﷺ کا اور ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا جو حبش میں گئے نمونہ کافی ہے۔ قرآن کریم سے اجتہاد کے رنگ میں اسی آیت سے ان کا حکم بھی مستنبط ہوسکتا ہے۔

یہ امر بھی یہاں یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی تنازعہ میں اصلی اور فیصلہ کن قول یا اللہ تعالیٰ کا کلام ہوسکتا ہے یا نبی کریم ﷺ کی حدیث۔ پس جہاں کہیں مسلمانوں میں کوئی تنازعہ ہو اس پر فیصلہ کرنے کے لیے مقدم قرآن شریف اور بعدہ حدیث ہے۔ اور قرآن شریف کا تقدم اس سے بھی ظاہر ہے کہ دوسری جگہ بصورت تنازعہ ﴿فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ [الشوریٰ: 10:42] ''تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔'' ہی فرمایا۔ یعنی اس کا حکم اللہ کے اختیار میں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح پر قرآن محفوظ ہے اس طرح پر حدیث محفوظ نہیں۔ بلکہ حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کا ہوجانا اور بسا اوقات روایت کا بالمعنی ہونا ایک امر مسلم ہے۔

اہل قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت:

ایک اور امر جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے ان لوگوں کا خیال ہے جو اہل قرآن کہلاتے ہیں جن کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی اطاعت شرک میں داخل ہے اس کی تردید [نمبر: 516] میں ہوچکی ہے۔ اس موقعہ پر یہ لوگ یوں معنی کرتے ہیں:

''اے ایمان والو! دین اسلام کے بارے میں حکم مانو اللہ تعالیٰ ہی کا۔ یعنی حکم مانو صرف کتاب اللہ ہی کا اور سلطنت کے بارے میں حکم مانو حکام وقت کا جو تم پر حکمران ہوں۔ پس اگر جھگڑ پڑو تم آپس میں دین اسلام کے کسی امر میں تو اس کو رجوع کرو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف یعنی خالص کتاب اللہ کے ہی حکم کی طرف۔'' (ترجمہ القرآن بآیات الفرقان مؤلفہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی)

قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ فیصلہ کرائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار

اب قرآن شریف کو اپنی رائے کے ماتحت کرنے کے لیے کس قدر باتیں اپنے پاس سے ڈال کر تحریف کا رنگ اختیار کیا ہے۔ پھر ایک اور دقت یہ ہوگی کہ اس قدر زوائد کے بڑھانے سے نتیجہ کیا نکلا۔ اول یہ کہ سلطنت کے امور کا کوئی تعلق دین اسلام سے نہیں۔ یہ کیسی لغو اور بے معنی بات ہے۔ وہ دین اسلام جو معاشرت کے بارے میں احکام دیتا ہے، تمدن کے بارہ میں احکام دیتا ہے، معمولی انسانی تعلقات کے بارہ میں احکام دیتا ہے۔ کیا وہ سلطنت کے بارہ میں کوئی احکام نہیں دیتا؟ بلکہ سلطنت کے بارہ میں جس قدر احکام ہوں ان کے لیے حکام وقت کو مقرر کر دیتا ہے خواہ ایک بے دین ہی بادشاہ ہو۔ سلطنت کے بارہ میں وہ جو حکم دے وہی ماننا ہوگا۔ یہاں تک کہ دین اسلام کے بارہ میں تو تنازع بھی جائز ہے مگر سلطنت کے احکام کے بارہ میں کوئی تنازع جائز نہیں۔ رسول سے اختیار چھینتے چھینتے ایک حصہ دین اسلام کا بادشاہ کو رسول سے بڑھ کر مرتبہ دے دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت بلا چوں و چرا اور بلا تنازع کرنی چاہیے اسی طرح بادشاہ کی اطاعت بلا چوں و چرا اور بلا تنازع کرنی چاہیے اور کسی قسم کا اختلاف بادشاہ وقت کے ساتھ گویا حکم الٰہی سے انحراف ہے۔

اہل تشیع اور قادیانی احمدی:

اس آیت میں اہل تشیع کا بھی جواب ہے جنہوں نے امام معصوم کا وجود مانا ہے اور احمدیوں میں قادیانی گروہ کا بھی جواب ہے جنہوں نے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو نبی اور رسول مانا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی امام معصوم ہونا ہوتا جو غلطی کر ہی نہ سکتا یا کوئی نبی اور رسول ہونا ہوتا جس کی اطاعت اسی طرح کرنی ضروری ہوتی جس طرح آنحضرت ﷺ کی تو ایسے شخصوں کا ذکر اس آیت میں بھی ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی اس امت کے اندر ہوگا خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان انسان کیوں نہ ہو وہ اولی الامر میں ہی داخل ہوگا اور اس کے ساتھ تنازع بھی ہو سکتا ہے اور ایسے تنازع کی صورت میں اصلی مرجع اللہ یعنی اس کی کتاب اور رسول یعنی سنت نبوی ہی رہیں گے۔ ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ایک حکم میں رہیں گے اور رسول ﷺ ایک حکم میں۔ یعنی وہ ہمیشہ مطیع رہیں گے اور رسول ہمیشہ مطاع رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ ان میں آئمہ اور علماء و فقہاء اور حکام کی اطاعت ضروری ہوگی مگر کوئی بھی ہو اس کے ساتھ تنازع ہو سکتا ہے اور اس لیے اصل مطاع بھی رسول اللہ ﷺ ہی رہے۔ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی بعض صحابہ کو اختلاف ہو جاتا تھا اور کتاب اللہ ہی فیصلہ کرتی تھی۔ امام بخاری اور مسلم اور امام ابوحنیفہ اور مالک اور شافعی اور احمد اور ہر صدی کے مجددین اور مسیح موعود کے ساتھ بھی اگر کسی کو اختلاف ہو تو حکم کتاب اللہ اور سنت نبوی ہوں گے اور اصل اور صحیح مرجع ساری امت کے محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہوں گے۔ اسی لیے خاتمہ پر فرمایا کہ یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔ کیونکہ اس میں امت کا اتفاق اور اتحاد قائم رہ سکتا ہے۔ اپنے لیے الگ الگ مطاع بنا لیے جائیں تو تفرقہ پیدا ہو کر ایک رسول کے بھیجنے کی جو غرض تھی وہ مفقود ہوتی ہے اور یوں بھی تمام کو ایک ذیل میں رکھ کر جمہوریت کا اعلیٰ درجہ کا اصول دنیا میں قائم کیا ہے۔

الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾

کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو گمراہی میں دور بہکا لے جائے۔ (679)

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، تو تُو منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے ہٹتے ہوئے رکتے ہیں۔

679- يَزْعُمُوْنَ۔ زَعَمَ اس قول کا بیان کرنا ہے جس پر جھوٹ کا گمان ہو۔ (غ) اس لیے قرآن کریم میں یہ ایسے ہی مقامات پر بولا گیا ہے۔ جہاں اس کے کہنے والے کی مذمت مقصود ہو۔ جیسے ﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا﴾ [التغابن: 7:64] ''جو کافر ہیں گمان کرتے ہیں کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔'' ﴿بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾﴾ [الكهف: 48:18] ''بلکہ تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہارے لیے وعدے کے پورا ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔'' ﴿كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ [الأنعام: 22:6] ''تم جھوٹے دعوے کرتے تھے۔'' ﴿زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ﴾ [بنی إسرائيل: 56:17] ''جنہیں تم اللہ کے سوائے (معبود) خیال کرتے ہو۔''

یہودیوں کے حالات سے عبرت دلا کر مسلمانوں کو اخلاص اور ادائے امانت کی نصیحت کرتے ہوئے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جو منہ سے ماننے کا دعویٰ کرتے تھے یا ہیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے۔ مفسرین نے یہاں ایک مسلمان بشر اور ایک یہودی کے تنازع کا قصہ لکھا ہے جس میں مسلمان نے (جو در پردہ منافق تھا) رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو نہ مانا۔ لیکن گو آیت کے الفاظ ایک چھوڑ صدہا واقعات پر صادق آ سکتے ہیں کسی ایک خاص واقعہ سے اس کو مخصوص کرنا ٹھیک نہیں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں اور اس میں **عام منافقوں کا ذکر ہے**۔ کیونکہ جب اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا تو ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا جو منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے مگر دل سے احکام الٰہی کو نہ مانتے تھے۔ یہ لفظ کہ جو پہلے نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ ظاہر نہیں کرتے کہ یہ یہود میں سے تھے۔ کیونکہ ہر ایک مسلمان سارے پہلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی وحی پر ایمان لاتا ہے اور نہ ان کے طاغوت کی طرف اپنے فیصلے لے جانے سے خاص جھگڑوں میں حکم بنانا ہی مقصود ہے بلکہ تمام دینی معاملات میں بجائے اللہ اور رسول کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے کے اللہ کے سوائے دوسروں کو حکم بناتے اور ﴿يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ﴾ سے یہ مراد ہونا ہے کہ وہ طاغوت کے پیچھے لگتے اور اس کا کہا مانتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے مقابل پر فرمایا ﴿وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾ طاغوت کے کفر کا یعنی اس کی بات نہ ماننے کا حکم ان کو دیا گیا تھا اس کی مزید وضاحت اگلی آیت سے ہوتی ہے۔

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۚ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾

تو پھر کیا حال ہوگا جب ان کو اس کی وجہ سے مصیبت پہنچے گی جو ان کے اپنے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ ہمارا تو سوائے بھلائی اور اتفاق کے اور کچھ منشا نہ تھا۔ (680)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾

یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ پس ان سے منہ پھیر لے اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ان کے حق میں اثر کرنے والی بات کہہ۔ (681)

680- يَحْلِفُوْنَ۔ حَلِفٌ اصل میں اس عہد کو کہتے ہیں جو قوم کے درمیان ہو اور چونکہ ایسا عہد قسم پر لیا جاتا تھا اس لیے حَلَفٌ ایسی قسم کو کہا جانے لگا جس پر عہد لیا جائے اور پھر ہر ایک قسم پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔

تَوْفِيْقٌ۔ وَفَّقَ دو چیزوں کے درمیان مطابقت کا نام ہے اور اسی سے توفیق ہے جو اتفاق کے ہم معنی ہے۔

یہاں بتایا ہے کہ یہ منافق عنقریب قسمیں کھائیں گے کہ ہم جو دوسرے لوگوں سے تعلقات رکھتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم تم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے بلکہ یہ کہ ان لوگوں کے ساتھ ہم نیکی کریں اور فریقین میں موافقت پیدا ہو۔ ان کی ان قسموں کے جھوٹا ہونے کا قرآن شریف میں بارہا ذکر ہے ﴿وَ يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ﴾ [المجادلة: 14:58] ''اور وہ جھوٹ پر قسمیں اٹھاتے ہیں۔'' ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ [المنافقون: 2:63] ''انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔'' وغیرہ اور یہاں بھی اگلی آیت میں یہ بتایا ہے۔ دوسری جگہ ان کا قول منقول ہے ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ [البقرة: 11:2] ''ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔'' ہم دونوں فریق میں میل ملاپ کرانا چاہتے ہیں۔

681- ﴿فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ یہاں ﴿فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ کے معنی تین طرح پر ہو سکتے ہیں۔

① اول ﴿فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا﴾ یعنی [قَوْلًا مُؤَثِّرًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ] ایسی بات جو ان کے دلوں میں اثر کرنے والی ہو۔

② دوم [فِيْ شَانِ اَنْفُسِهِمْ] یعنی ان کے اپنے بارہ میں یا وہ بات جو ان کی حالت کو ظاہر کرنے والی ہے۔

③ سوم [خَالِيًا بِهِمْ لَا يَكُوْنُ مَعَهُمْ اَحَدٌ] یعنی ان کو الگ کر کے یا خلوت میں۔

بَلِيْغًا۔ بَلِيْغٌ۔ بَلَغَ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک مقصد کی غایت کو پالینا۔ (غ) اور قول بلیغ یا بلاغت والا کلام دو طرح پر ہو سکتا ہے جیسا کہ امام راغب نے کہا ہے ایک یہ کہ بذاتہٖ بلیغ ہو۔ اور اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ تین اوصاف ضروری ہیں۔ لغت کے

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔(682) اور اگر وہ

لحاظ سے درست ہو۔ جو معنی مقصود میں اس کے ساتھ مطابقت ہو اور فی نفسہٖ بات سچی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ کہنے والے کے لحاظ سے اور جس کو بات کہی گئی ہے بلیغ ہو یعنی کہنے والا جو کہنے کا مقصد رکھتا ہو اس کو ایسے طور پر کہے کہ جس کو بات کہی گئی ہے وہ اسے قبول کر لے اور یہاں ان دونوں معنوں کی طرف اشارہ ہے۔

682- چونکہ اصل مضمون اس رکوع کا یہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی جائے اور اسی اطاعت نہ کرنے والوں کو ہی جب وہ منہ سے اطاعت کا اقرار بھی کریں منافق بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے اب کھول کر فرماتا ہے کہ رسول تو بھیجا ہی اس غرض کے لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ لیکن چونکہ اصل حق اطاعت کا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس لیے ساتھ ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ فرمایا یعنی یہ کہ اس اجازت کا اعلام اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام رسول کے واسطہ سے ہی پہنچتے ہیں۔

ہر رسول مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا:

یہ آیت رسولوں کے ایک امتیازی نشان پر فیصلہ کن ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ کوئی رسول نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ایک شریعت ہو اور وہ اس شریعت میں مطاع ہو۔ اور اس کے بارہ میں اسی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ اگر وہ صرف اپنے سے کسی پہلے رسول کی شریعت کی طرف ہی بلاتا ہے۔ تو فی الحقیقت وہ مطاع نہ ہوا بلکہ مطاع وہ پہلا رسول ہوا جس کی وہ شریعت ہے اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ایک رسول کے لیے لازمی ہے کہ وہ مطاع بھی ہو۔ پس اس آیت میں ایک ایسا حصر ہے کہ اس سے باہر نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر ایک رسول کے لیے خود مطاع ہونا لازمی ہے اس لیے چونکہ قرآن نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس امت کے اندر ہمیشہ کے لیے حقیقی مطاع ایک محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہوں گے جیسا کہ ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء 59:4] ''پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ'' سے ظاہر ہے اس لیے آپ کے بعد اس امت کے اندر کوئی رسول نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی رسول ہوگا تو وہ خود مطاع ہوگا اور اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ مطاع نہ رہیں گے اور یہ خلاف قرآن کے ہے۔ پس ختم نبوت پر یہ آیت فیصلہ کن ہے۔ جب اس کو ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ﴾ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے اور اب تا قیامت کوئی رسول قطعاً نہیں آ سکتا نہ کوئی پرانا رسول آ سکتا ہے اور نہ نیا۔ کیونکہ جو کوئی بھی رسول ہو کر آئے گا وہ خود مطاع ہوگا اور یہ ہو نہیں سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد:

جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے منتظر ہیں وہ بھی اس آیت پر غور کریں اور جن لوگوں نے آج تیرہ سو سال بعد ایک رسول کا آنا مان لیا ہے وہ بھی غور کریں۔ اول الذکر سوچیں کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو لازماً منصب رسالت کے ساتھ آنے چاہئیں۔ کیونکہ ایک رسول کا منصب رسالت کسی صورت میں چھینا نہیں جا سکتا۔ یہ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام:

جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

اس وقت جب اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا تیرے پاس آتے ہیں پھر اللہ کی بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا پاتے۔ (683)

124:6] ''اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت کو رکھے۔'' کے خلاف ہے اور پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعوذ باللہ کسی نا قابلیت کی وجہ سے ان کا یہ منصب چھینا گیا۔ لیکن اگر منصب رسالت کے ساتھ وہ آئیں تو پھر اس وقت مطاع وہ ہوں گے نہ حضرت نبی کریم ﷺ۔ گویا آنحضرت ﷺ کی رسالت کا زمانہ ختم ہو جائے گا اور یہ عقیدہ نہایت فاسد ہے اور وہ لوگ جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کو رسول بناتے ہیں وہ بھی غور کریں کہ وہ شخص جسے وہ رسول بناتے ہیں بار بار بیان کرتا ہے کہ میری گردن پر محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا جوا اسی طرح پر ہے جیسے ہر ایک مسلمان کی گردن پر اور میں نے جو کچھ پایا اسی کی پیروی سے اور اسی کی اطاعت سے پایا۔ اس نے بار بار اپنا مطاع اور سب مسلمانوں کا مطاع رسول اللہ ﷺ کو ہی بتایا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بعض انبیاء بھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پیرو تھے؛ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو ان کو نئی شرائع نہ دی گئی ہوں، مگر وہ سابق شریعت میں کمی بیشی تغیر تبدل اپنے زمانہ کو ضرورت کے مطابق کر سکتے تھے۔ اس لیے جو شریعت وہ پیش کرتے تھے وہ اپنی مہر سے پیش کرتے تھے۔ جس بات کو وہ درست کہہ دیں وہ درست اور جس کو وہ غلط کہہ دیں وہ غلط ماننی ضروری تھی۔ اس لیے بہر حال مطاع وہ خود ہی تھے گو وحی الٰہی نے ان کو یہی ہدایت کی ہو کہ وہ موسوی شریعت کی پیروی کریں۔ لیکن اس امت کے اندر ایسا کوئی انسان نہیں ہو سکتا جو ایک شوشہ بھی شریعت کا کم و بیش کر سکے۔ اس لیے اس امت میں تا قیامت ایک ہی مطاع ہوگا اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

683- جب رسول ﷺ کی اطاعت کے بارہ میں قطعی حکم دے دیا تو فرمایا کہ بعض وقت انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ سو اگر ان لوگوں سے بھی کوئی غلطی ہو گئی تھی تو اس کا علاج تو یہ تھا کہ استغفار کرتے اور رسول اللہ بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو اللہ ان کو معاف کر دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کا استغفار ساری امت کے لیے تھا۔ جس میں منافق تک بھی شامل تھے اور اپنی ذات تک محدود نہ تھا۔

﴿اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ﴾ کے معنی مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی یوں کرتے ہیں ''پھر معافی دے دے بالکل ان کو کتاب اللہ المجید۔'' مگر لطف یہ ہے کہ کتاب اللہ المجید کے معانی دینے کے بعد ﴿لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾ ہے جس کے معنی مولوی صاحب کو بھی یہی کرنے پڑے ہیں ''تو وہ ضرور پائیں گے اللہ تعالیٰ کو بالکل معاف کرنے والا ہر طرح سے مہربان۔'' تعجب ہے کہ پہلے کتاب اللہ معافی دیتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ حالانکہ کتاب اللہ کا معافی دینا اور اللہ کا معافی دینا ایک

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

سو نہیں تیرے رب کی قسم وہ ایمان ہی نہیں لاتے جب تک کہ وہ تجھے اس میں حَکم (نہ) بنائیں جو ان میں آپس میں اختلاف ہو پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور پوری پوری فرمانبرداری کریں۔ (684)

ہی ہے اور پھر استغفار کے معنی معافی دینا کسی لغت میں میری نظر سے نہیں گزرے اور نہ مولوی صاحب نے خود ان معنوں کی کوئی سند دی ہے۔

684- فَلَا۔ لَا کو یہاں بعض نے تاکید معنی قسم کے لیے صلہ مان کر گویا زائد مانا ہے۔ مگر درحقیقت ایسے مقامات پر لَا نافیہ ہی ہوتا ہے اور نفی کسی پہلی چیز کی ہوتی ہے۔ خواہ مفہوم ہی ہو جیسے یہاں مراد ہے [لَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا يَزْعُمُوْنَ] وہ بات نہیں جو گمان کرتے ہیں۔ کیونکہ شروع میں ان کے گمان کا ذکر تھا ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ﴾ [النساء: 60:4] ''کیا تو نے ان (کی حالت) پر غور نہیں کیا جو دعویٰ کرتے ہیں۔''

وَرَبِّكَ۔ وَاؤ قسم کے لیے ہے۔ قرآن کریم میں قسموں کا کیا منشا ہے اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا جہاں دوسری چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ یہاں قسم ''تیرے رب'' کی ہے۔ اس لیے جو اعتراض قسموں پر عموماً کیا گیا ہے وہ یہاں وارد نہیں ہوتا۔ لیکن اس قدر یہاں بھی بتا دینا ضروری ہے کہ الفاظ جیسے انسانوں کی طرف منسوب ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے افعال کا ذکر بھی انہی الفاظ میں ہی ہوگا۔ حالانکہ دونوں استعمالوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے [دیکھو نمبر: 27]۔ اسی طرح قسم میں ہے انسان جب قسم کھاتا ہے تو وہ گویا ایک زبردست شہادت پیش کرتا ہے۔ اس لیے **خدا کی قسم کا اصل منشا** ایک زبردست شہادت کا پیش کرنا ہے اور جہاں جہاں اور جس جس چیز کی قسم قرآن کریم میں کھائی گئی ہے وہ ایک شہادت کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں وہ شہادت جس کی طرف اشارہ ہے خود لفظ رَبِّكَ میں ہے یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی ربوبیت کرنے والی ہستی۔ وہ خدا جس نے محمد رسول اللہ ﷺ کی ربوبیت کر کے آپ کو ایک اعلیٰ مقام پر پہنچایا اس کا رسول کو بھیجنا، اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کرنا ایک بے معنی امر نہیں۔ اس نے اس لیے اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کی تا وہ انسانوں کی تربیت کرے اس لیے اگر اس کو مطاع اور حکم نہ مانا جائے تو وہ تربیت بھی نہیں کر سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ کے محمد رسول اللہ ﷺ کی تربیت کرنے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ مطاع ہوں۔

حَرَجٌ۔ نہایہ میں ہے کہ حرج کے اصل معنی ضَيِّقٌ یعنی تنگی ہیں۔ اور اسی میں ایک قول ہے کہ [حَرَجٌ اَضْيَقُ الضَّيْقِ] ہے یعنی خفیف سے خفیف تنگی اور اسی سے گناہ معنی ہو گئے ہیں اور مفردات میں ہے کہ حرج اصل میں [مُجْتَمِعُ الشَّيْءِ] کو کہتے ہیں اور اس سے ضیق کے معنی نکلے ہیں۔ مجاہد نے حَرَجٌ سے مراد یہاں شک لیا ہے اور بعض مفسرین نے کسی قسم کی کراہت کا شائبہ کہا ہے۔ (ر)

وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا

اور اگر ہم ان پر یہ لازم کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ، تو ان میں سے سوائے تھوڑے

﴿يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾۔ تَسْلِيْمٌ میں انقیاد ظاہر کی طرف اشارہ ہے جیسا ﴿لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ دل سے اس فیصلہ کو حق جانیں گویا جب یہ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کریں اسے دل سے سچا سمجھو تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ظاہر طور پر بھی اس کے پابند ہو جاؤ۔ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض وقت انسان ایک بات کو سچ جانتا ہے مگر عناد کی وجہ سے اسے قبول نہیں کرتا۔ میرے نزدیک تسلیم کو بعد میں بطور ترقی اس لیے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو دل سے سچا ماننے والے تو بہت ہیں مگر ظاہر طور پر ان کی پابندی کرنے والے تھوڑے۔ تو فرمایا کہ صرف یہی کافی نہیں کہ تم کہہ دو کہ ہم دل سے سچا مانتے ہیں بلکہ اس فیصلہ کے پابند بھی ہو جاؤ۔

اس آیت کی ذیل میں بخاری نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کے جھگڑے کا ذکر ہے جو پانی کے متعلق تھا اور جس میں فیصلہ زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا۔ اس حدیث کے آخر میں آتا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: [فَمَا أَحْسَبُ هَذِهِ الْآيَاتِ إِلَّا نَزَلَتْ فِي ذٰلِكَ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ....، حديث:4585) یعنی میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیات اسی بارہ میں نازل ہوئیں۔ ان الفاظ سے لازماً بلکہ ان آیات کا اس جھگڑے پر چسپاں ہونا مراد ہو سکتا ہے اور غالباً یہی مراد ہے کیونکہ جس اطاعت کا ذکر یہاں چلتا ہے وہ اطاعت عام معاملات میں ہے نہ خاص قضایا میں۔ چنانچہ اس رکوع کی آخری سے پہلی آیت اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے جہاں فرمایا ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ''جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا سو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا۔'' ظاہر ہے کہ یہاں اطاعت سے مراد امور دینی میں اطاعت ہے یعنی ان راہوں پر چلنا جو اللہ اور رسول نے بتائی ہیں اور خود اس آیت کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں فرمایا جو کوئی اختلاف باہم مسلمانوں میں ہو اس میں حکم رسول اللہ ﷺ کو بنایا جائے۔ تب ایک شخص حقیقت ایمان پر قائم ہوتا ہے اور جو شخص کچھ تو نبی کریم ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور کچھ اپنی خواہشات کی وہ حقیقت ایمان پر قائم نہیں اور پھر نبی کریم ﷺ کے فیصلے پر شرح صدر سے راضی ہو یہاں تک کہ اس فیصلے کو قبول کرنے میں کسی قسم کی تنگی بھی سینہ میں نہ آنے پائے اور پوری تسلیم کے ساتھ فرمانبرداری کریں۔ باہمی اختلافات کا اس لیے ذکر کیا کہ جو شخص اختلاف میں اپنے فیصلہ کو نہ صرف قبول کر لے بلکہ اس فیصلہ پر اس کا شرح صدر ہو جائے۔ ایسا شخص ہر بات میں پوری پیروی کر سکتا ہے اور اگر معمولی جھگڑے بھی یہاں مراد لیے جائیں تو بھی مطلب وہی ہے۔ کیونکہ دنیا کے جھگڑوں میں مدعی مدعا علیہ دونوں کا کسی کے فیصلہ پر شرح صدر ہو جانا سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس شخص کے احکام کی دل میں حد درجہ کی عزت ہو۔ گویا یوں فرمایا کہ دین کے معاملات میں تو تم پر رسول اللہ ﷺ کی پیروی لازم ہی ہے مگر اس پیروی کو اس کمال تک پہنچانے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی تمہارا دنیوی جھگڑا بھی ہو تو اس جھگڑے میں جو کچھ فیصلہ نبی کریم ﷺ کریں اس کو نہ صرف تم قبول کرو بلکہ یہ خیال بھی تمہارے دل میں نہ آئے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے۔

فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾

لوگوں کے یہ نہ کرتے اور اگر وہ کریں جو ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو یقیناً ان کے لیے بہتر اور ثابت قدم رکھنے میں زیادہ مضبوط ہوتا۔ (685)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے محض قیاس اور اجتہاد سے نہیں ورنہ ان کے متعلق اس بات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ دل میں بھی شرح صدر ہو اور ظاہراً بھی تسلیم کامل ہو اور نہ یہ آیت جائدادوں اور مال کے جھگڑوں کے متعلق ہے بلکہ دینی احکام کے بارہ میں ہے۔

اجتہاد نبوی میں وحی خفی:

اور یہ بھی صاف ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اجتہاد محض انسانی قیاسات کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ضرور ایک وحی کی روشنی تھی (جس کو ہم وحی خفی کہتے ہیں کیونکہ کھلی وحی اس بارہ میں نہ ہوتی تھی۔) جس کی وجہ سے آپ ان فیصلوں میں قطعاً غلطی نہ کر سکتے تھے۔ ورنہ ﴿لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا﴾ غلط ٹھہرتا ہے۔

685- **اپنے آپ کو قتل کر دینے کے حکم سے مراد:** احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ نے کہا کہ اگر ایسا حکم ہوتا تو ہم اس کی تعمیل کرتے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [لِلْاِيْمَانِ اَثْبَتُ فِيْ قُلُوْبِ اَهْلِهٖ مِنَ الْجِبَالِ الرَّوَاسِيْ] (ث) ''ایمان اس کے اہل کے دلوں میں مضبوط پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہے۔'' دوسری طرف اللہ خود شہادت دیتا ہے کہ تھوڑے ضرور ایسا بھی کرتے ہیں ﴿وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ [السبأ: 13:34] ''اور میرے بندوں میں سے تھوڑے شکر گزار ہیں۔'' سے ثابت ہے کہ تھوڑے ہی اعلیٰ مقامات کو حاصل کیا کرتے ہیں۔ تیسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہاں فرمایا ہے کہ اگر ان پر ہم یہ فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل ہی کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ۔ حالانکہ گھروں سے تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نکلنا پڑا تو پھر ان دونوں حکموں کو ایک حکم میں رکھنے کا کیا مطلب؟ ایک یہ کہ اپنے آپ کو قتل کر دو جو کسی نے نہیں کیا۔ اور دوسرا یہ کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ جو تمام مہاجرین نے کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ﴿اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ سے مراد بھی ایسا امر ہے جو ﴿اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ کی طرح ممکن ہے یعنی دین کے لیے اس قدر قربانی کرنا کہ گویا انسان اپنے آپ کو اس راہ میں قتل کر دے۔ کیونکہ اشراف علی القتل یا اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کر دینا یا اپنی جانوں کی پروا نہ کرنا گویا اپنے آپ کو قتل ہی کر دینا ہے۔ اس کا تعلق اوپر کی آیت سے یہ ہے کہ اوپر بھی ایک حکم، بظاہر سخت حکم، رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو قبول کرنے اور کامل طور پر آپ کی اطاعت کرنے کا دیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے ان سب انسانوں کا جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں یہ فرض ہوگا کہ امور دینی میں آپ کے فیصلوں کو قبول کریں اور کسی قسم کا شائبہ کراہت کا ان کے دلوں میں نہ آئے۔ بلکہ شرح صدر سے قبول کریں۔ تو اب فرماتا ہے کہ یہ حکم دراصل سخت نہیں انسان اپنے گھر میں رہ کر، اپنے کاروبار کو سرانجام دے کر رسول اللہ ﷺ کے احکام کی فرمانبرداری بھی کر سکتا ہے۔ اس سے سخت تر مقام یہ ہے کہ انسان دین کے لیے ایسے کام

وَّ اِذًا لَّاٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۶۷﴾

اور یقیناً تب ہم ان کو اپنی جناب سے بڑا اجر دیتے۔

وَّ لَهَدَیْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۶۸﴾

اور یقیناً ان کو سیدھے رستہ پر چلاتے۔

وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے تو یہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا' (یعنی) نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالح لوگوں (کے ساتھ)' اور یہ اچھے ساتھی ہیں۔ (686)

کرے کہ اپنی جان کی پروا بھی نہ کرے، جو قتل نفس کے قائم مقام ہے۔ مثلاً اعدائے دین کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جانا یہ قتل نفس سے کم نہیں۔ اور پھر یہ سخت مقام ہے کہ دین کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ دو۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے چھوڑ کر دکھایا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مشکل کام ہم نے ساری امت پر ہمیشہ کے لیے فرض نہیں کر دیئے کیونکہ ان کے کرنے کے اہل بھی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ہاں سب لوگوں کو ہمیشہ کے لیے ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ دین میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں اور آپ کی حد بندیوں سے باہر قدم نہ رکھیں۔ اپنے کاروبار دنیا کو بھی سرانجام دیں اپنے گھروں میں بھی رہیں اور ساتھ دین کی حدود کو بھی نگاہ رکھیں۔

﴿لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ﴾ میں یہ بتایا ہے کہ اگر وہ اطاعت رسول پورے طور پر کریں تو یہ ان کی دونوں طرح پر بھلائی کا موجب ہوگا۔ دنیا میں بھی ان کی بہتری کا موجب ہوگا اور ایمان میں بھی وہ مضبوط ہوں گے اور ثابت قدمی میں بہت ترقی کریں گے۔ یا آخرت میں ان کی بھلائی کا موجب اور دنیا میں ان کی ثابت قدمی کا موجب ہوگا۔ اس سے یہ منشا نہیں کہ حفاظت دین کے لیے اپنے آپ کو قتل تک کے لیے پیش کرنا یا اپنے گھر کو چھوڑ دینا کسی پر بھی فرض نہیں بلکہ اس میں ایک پیشگوئی پائی جاتی ہے کہ وہ حالات دنیا میں پیدا ہو جائیں گے کہ ہجرت یعنی وطن کے چھوڑنے اور دین کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ سوائے نادر صورتوں کے جو معدوم کے حکم میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بھی آتا ہے: [لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ] (صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب فَضْلُ الْجِهَادِ وَالسِّيَرِ: 2783) ''فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں۔''

686- صِدِّیْقِیْنَ۔ صِدِّیْقٌ مبالغہ کا صیغہ ہے اسی لیے اس کے اصل معنی ہیں راستی میں کمال کو پہنچا ہوا۔ (ل) امام راغب کہتے ہیں

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِیْمًا ۝ؑ
یہ فضل اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کافی جاننے والا ہے۔

ع 9 11 6

صدیق وہ ہے جس کا صدق کثرت سے ظاہر ہو اور کہا گیا ہے بلکہ صدیق وہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولے۔ اور کہا گیا ہے بلکہ وہ جس کو اس قدر سچ بولنے کی عادت ہے کہ جھوٹ اس سے کبھی سرزد نہیں ہوسکتا۔ اور بعض نے کہا ہے وہ شخص ہے جو اپنے قول اور اعتقاد دونوں میں سچا ہو اور جس نے اپنے صدق کو اپنے فعل سے سچ ثابت کر دکھایا ہو۔ یہ تو اس کے عام معنی ہیں اور اصطلاح شریعت میں ہر ایک شخص جو ہر ایک اللہ کے حکم کو سچا مان لے اور اس میں سے کسی کے بارہ میں اس کے دل میں کوئی شک واقع نہ ہو اور نبی کریم ﷺ کی تصدیق کرے وہ صدیق ہے۔ (ل) پس عام معنی سے یہ انتقال خاص معنی کی طرف یوں ہوا کہ ایک شخص اس قدر سچ بولنے کا عادی ہے کہ نہ صرف اس سے اپنی ذات میں کبھی کوئی جھوٹ سرزد نہیں ہوتا بلکہ جب راستی اس کے سامنے آتی ہے تو اس وجہ سے کہ اسے صدق سے گویا ایک قدرتی تعلق ہے وہ اس راستی کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اصطلاح شریعت میں یوں کہنا چاہیے کہ نور ایمانی اس میں اس قدر غالب ہوتا ہے، یا ایمان کے لحاظ سے وہ ایسے کمال کو پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ راستی سے اس کو ایک قدرتی تعلق ہو جاتا ہے۔ پس صدیقیت کا مرتبہ درحقیقت کمال ایمانی کا مرتبہ ہے۔

شُهَدَآءِ۔ شَهِيْدٌ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی وہ کامل علم رکھنے والا جو اس علم کو بیان کر دے یا ظاہر کر دے گویا شہید کا کمال بلحاظ علم کے ہے جس طرح صدیق کا کمال بلحاظ ایمان کے ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ شہید مرتبہ علم میں متقدم اور مرتبہ ایمان میں متاخر ہے۔ اور صدیق مرتبہ ایمان میں متقدم اور مرتبہ علم میں متاخر ہے۔ اور اسی لحاظ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مدار صدیقیت قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ کمال ایمانی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیونکہ کمال علمی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔

صٰلِحِیْنَ۔ صَالِحٌ کا مادہ صَلُحَ ہے اور صلاح فساد کی ضد ہے۔ کثرت استعمال میں وہ افعال سے مخصوص ہیں۔ (غ) اور قرآن کریم میں بہ کرّات ﴿اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کہہ کر صلاح کو عمل سے وابستہ کیا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ صالح کا کمال عمل سے وابستہ ہے۔ اس لیے بعض نے ولایت کو صالحیت کا مقام قرار دیا ہے اور اس کا مدار سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ٹھہرایا ہے۔

رَفِیْقٌ (رِفْقٌ بمعنی نرمی سے) وہ ہے جو تم سے نرمی کرے۔ بالخصوص وہ شخص جو سفر میں ساتھی ہو۔ (ل)

رسول کی اطاعت سے منعم علیہم کی رفاقت ملتی ہے:

اس سارے رکوع میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر ہی زور دیا ہے۔ اطاعت نہ کرنے والوں کو منافق قرار دیا ہے اور اب اطاعت کرنے والوں کے اجر پر اس کا خاتمہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جو بڑے بڑے انعامات کے وارث ہوئے ہیں۔ اور وہ بڑے انعام پانے والے کون لوگ ہیں؟ جو نبوت

کے مقام تک پہنچائے گئے ہیں اور کمال ایمانی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمال علمی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمال عملی کو حاصل کر لیتے ہیں۔ تو گویا یوں فرمایا کہ اطاعت رسول سے انسان کو کامل انسانوں کی رفاقت حاصل ہو جاتی ہے گو وہ خود اس کمال کو پہنچے یا نہ پہنچے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ کمال ایمانی اور کمال علمی اور کمال عملی کو حاصل کرنے والے تھوڑے لوگ ہوتے ہیں اور اکثر لوگ بوجہ طرح طرح کے اشغال اور کدورتوں کے یا دیگر حالات کے کمال کو نہیں پا سکتے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی جنہوں نے حتی الوسع نبی کریم ﷺ کی اطاعت کی کوشش کی ہے گو انہوں نے ان کمالات کو حاصل نہ کیا ہو، ان کمالات والوں کی رفاقت عطا فرمائی۔ چنانچہ قرآن کریم کے اپنے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ اول معیت کا ذکر کیا پھر ﴿حَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا﴾ کہہ کر بتایا کہ ان کی رفاقت ان کو ملے گی۔ اور آخر آیت میں فرمایا ﴿ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے۔'' کہ صرف اطاعت پر ہی اتنا بڑا اجر عطا فرمایا اور پچھلی آیت کا مضمون بھی یہی چاہتا ہے۔

احادیث کی شہادت:

احادیث کو دیکھا جائے تو ان سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ترمذی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ] (جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء في التجار وتسمية النبي ﷺ إياهم: 1209) تاجر صادق امین نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نبی بن جاتا ہے اور صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ایک قوم سے محبت کرتا ہے اور ان میں ملا نہیں یعنی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچا تو آپ نے فرمایا: [اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ] (صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب عَلاَمَةِ حُبِّ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: 6168) ''آدمی ان کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت رکھتا ہے۔'' (ث) اور انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے: [إِنِّي لَأُحِبّ رَسُول اللهﷺ وَأُحِبّ أَبَا بَكْر وَعُمَر رَضِيَ الله عَنْهُمَا وَأَرْجُو أَنَّ اللهَ يَبْعَثُنِي مَعَهُمْ وَإِنْ لَّمْ أَعْمَل كَعَمَلِهِمْ.] (ث) ''میں رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتا ہوں اور حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ساتھ مبعوث کرے گا گو میں نے ان کے سے عمل نہیں کیے۔''

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنت کے بعض اعلیٰ منازل کا ذکر کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ انبیاء علیہم السلام کی منزلیں ہیں جن پر ان لوگوں کے سوائے کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ تو آپ نے فرمایا [وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ رِجَالٌ آمَنُوا بِاللهِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِينَ] (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ وَأَنَّهَا مَخْلُوقَةٌ: 3256) (ث) قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ لوگ بھی (ان کو حاصل کریں گے) جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو غمگین دیکھا تو دریافت فرمایا۔ اس نے عرض کیا کہ اب تو ہم صبح شام آپ کے ساتھ ہوتے ہیں، آپ کے چہرہ کو دیکھتے ہیں، آپ کے ساتھ بیٹھتے ہیں، لیکن بعد وفات آپ اعلیٰ مقام پر ہوں گے جہاں ہم نہیں پہنچ سکیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

پس یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں مکملین کی رفاقت اور معیت کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا یہ رفاقت محض آخرت کے لیے ہے یا

دنیا میں بھی اس سے کچھ حظ ملتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اسلام نے جتنے انعامات کا وعدہ دیا ہے ان کو کسی نہ کسی رنگ میں اس عالم میں بھی پورا کر دیا ہے۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ مومنین کو اس دنیا میں بھی کچھ حظ ان مراتب کمال سے مل جاتا ہے لیکن اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس صورت میں مومنین کو ایسا حظ مل جاتا ہے تو کیا وہ منعم علیہم میں داخل ہو کر نبی، صدیق، شہید اور صالح بن جاتے ہیں یا نہیں؟ صالح کے مرتبہ پر ایک مومن کا پہنچ جانا اس سے تو قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ شہید اور صدیق کے مرتبہ پر پہنچنے پر بھی بہتیری آیات شاہد ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرة: 143:2] ''تا کہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔'' ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [الحدید: 19:57] ''اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔'' لیکن بذریعہ ایمان، بذریعہ اطاعت، بذریعہ اعمال صالحہ کسی کا نبوت کے مرتبہ پر پہنچ جانا اس کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں ملے گا۔ بلکہ رسالت کے متعلق فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام: 124:6] ''اللہ خود بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔'' صدیقیت کا مقام، شہادت کا مقام، صالح کا مقام یہ سب ﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا﴾ [العنکبوت: 69:29] ''اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں۔'' کے ماتحت انسان کی کوشش اور سعی سے مل جاتے ہیں۔ جیسا کہ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [الحدید: 19:57] ''اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔'' سے صاف ظاہر ہے۔ ایمان جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو وہی صدیق اور شہید کا مقام ہے۔ ایمان کے لیے اس سے آگے کوئی مرتبہ نہیں۔ اکتساب کا کمال انسان کو صدیقیت کے مرتبہ تک ہی پہنچانا ہے۔ جیسا کہ خود اس لفظ کے معنی میں بھی میں نے دکھایا ہے کہ یہ کمال ایمان پر دلالت کرتا ہے۔

اس اُمت میں صرف مبشرات یا نبوت اپنے لغوی معنی میں ہے:

نبوت اگر کوئی کمال ایمان کا مرتبہ ہوتا تو اس کا ذکر قرآن شریف میں ہونا چاہیے تھا، کسی حدیث میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہ تو قرآن شریف نے کہیں فرمایا کہ مومن جب ایمان میں ترقی کرتا ہے تو اسے نبی بنا دیا جاتا ہے، نہ کسی حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں قرآن کریم یہ ضرور فرماتا ہے کہ ﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [یونس: 64:10] مومنوں کو اس دنیا کی زندگی میں بشارتیں دی جاتی ہیں اور یہ بھی فرمایا ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ [حٰمٓ السجدة: 30:41] کہ ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ اور صحیح حدیث میں ہے [لَمْ يَبْقَ مِنْ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ] (صحيح البخاري، كتاب التعبير، باب الْمُبَشِّرَاتِ: 6990) ''نبوت سے کچھ باقی نہیں رہا مگر مبشرات۔'' اور دوسری حدیث صحیح میں ہے [لَقَدْ كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ فَإِنْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِي أَحَدٌ فَعُمَرُ] (صحيح البخاري، كتاب فضائل الصحابة، باب مَنَاقِبُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَبِي حَفْصٍ الْقُرَشِيِّ الْعَدَوِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: 3689) ''تم سے پہلے لوگوں میں ایسے لوگ ہوتے تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا تھا گو وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ میری امت میں اگر کوئی شخص ایسا ہے تو عمر ہے۔'' پس معلوم ہوا کہ نبوت کا ایک جزو، نبوت کا ایک رنگ یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے ہمکلام ہونا اس کا وجود اس

امت میں قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر قریباً قریباً امت کا اتفاق ہے کہ نبوت اپنے لغوی معنی کی رو سے یعنی محض خدا سے ہمکلام ہونے کے معنی میں تو اس امت میں جاری ہے، مگر نبوت اپنے خاص یا اصطلاحی مفہوم میں مسدود ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے:[إِنَ النُّبُوَّةَ عَامَّةٌ وَخَاصَّةٌ وَالَّتِيْ لَا ذَوْقَ لَهُمْ فِيْهَا هِيَ الْخَاصَّةُ أَعْنِيْ نُبُوَّةُ التَّشْرِيْعِ وَهِيَ مَقَامٌ خَاصٌّ فِي الْوِلَايَةِ. وَأَمَّا النُّبُوَّةُ الْعَامَّةُ فَهِيَ مُسْتَمِرَّةٌ سَارِيَةٌ فِيْ أَكَابِرِ الرِّجَالِ غَيْرُ مُنْقَطِعَةٍ دُنْيَا وَأُخْرٰى.] (روح المعانی:جلد5، صفحہ 76) یعنی ''نبوت عام ہے اور خاص۔ اور وہ جس میں اس امت کے لیے ذوق نہیں وہ نبوت خاصہ ہے یعنی تشریعی نبوت اور وہ ولایت میں مقام خاص ہے اور رہی نبوت عامہ سو وہ اکابر امت میں جاری وساری ہے اور دنیا وآخرت میں غیر منقطع ہے۔''

ولایت یا محدثیت:

گویا نبوت عامہ درحقیقت ولایت کا ہی نام ہے اس لیے اس کو محدثیت کے نام سے بھی پکارا ہے۔ کیونکہ اس میں محض اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا شرف ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں حاصل رہے گا۔ لیکن نبوت خاصہ یعنی جسے اصطلاح شریعت میں نبوت کہا جاتا ہے یا جس کا نام نبوت تشریعی ہے کیونکہ جو شخص اس منصب پر فائز ہوتا ہے وہ شریعت لاتا ہے یا شریعت میں کمی بیشی یا ترمیم تنسیخ کرنے کا مجاز ہے، وہ اس امت میں بند ہے کیونکہ شریعت کو نبی کریم ﷺ نے کمال تک پہنچایا۔

اب ہم آیت کو چھوڑ کر واقعات کو لیتے ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اللہ اور رسول کی کامل فرمانبرداری سے قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾[المائدۃ: 119:5] کی سند قرآن کریم میں موجود ہے۔ ''وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی۔'' اس سے بڑھ کر کامل اطاعت کا کوئی مرتبہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ لیکن ایک طرف اگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کامل اطاعت ایسی صفائی سے ثابت ہے تو دوسری طرف یہ بھی صفائی سے ثابت ہے کہ کوئی صحابی نبوت کے منصب پر کھڑا نہیں کیا گیا۔ یعنی نبی نہیں بنایا گیا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا[لَوْ كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرَ] (جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب في مناقب عمر بن الخطاب رضي الله عنه: 3686) ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔'' گویا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ میں وہ جوہر موجود تھے مگر نبی چونکہ اکتساب سے کوئی نہیں بنتا اور اللہ تعالیٰ کی مصلحت نے نبوت کا دروازہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ بند کر دیا، اس لیے نبوت کسی کو نہیں مل سکتی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تیرہ سو سال تک کوئی نبی اس لیے نہیں بنا کہ کسی نے اللہ اور رسول کی کامل اطاعت نہیں کی۔ وہ دشمن اسلام ہیں اور اسلام کی دنیا میں بدنام کرتے ہیں۔ اگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایک گروہ نے کامل اطاعت نہ کی تھی تو کیا خدا نے بھی غلطی سے ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ کی سند ان کو دے دی۔ غرض اگر کامل اطاعت سے کوئی نبی بن سکتا تو صحابہ کا گروہ اس کا حقدار تھا کہ ان میں سیکڑوں نبی ہوتے۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا، اس لیے اطاعت سے نبوت کا ملنا ایک غلط خیال ہے جس کی صاف تردید قرآن سے، حدیث سے اور واقعات سے ہوتی ہے۔ ہاں ایک رنگ نبوت بے شک اس امت کے کاملین کو مل جاتا ہے اور یہ رنگ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی ملا۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ کسی صحابی کو کسی نبی سے اور کسی کو کسی نبی سے آنحضرت ﷺ سے تشبیہ دی۔ حتی کہ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے بچاؤ (کا سامان) لے لیا کرو۔ پھر گروہ گروہ ہو کر نکلو یا اکٹھے نکلو۔ (687)
وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ	اور تم میں سے وہ بھی ہے جو ضرور پیچھے رہ جاتا ہے پھر اگر تم

مشابہت دی۔

687- حِذْرَ۔ حِذْرٌ کے معنی ڈرانے والی چیز سے اپنا بچاؤ کرنا ہیں۔ پس حِذْرَ سے مراد ہے جس میں بچاؤ کا سامان ہو جیسے ہتھیار وغیرہ۔ (غ)

اِنْفِرُوْا۔ نَفَرَ کے معنی ہیں کسی چیز سے بھاگنا یا کسی چیز کی طرف بھاگنا۔ (غ) اس لیے نفور، نفرت کے معنی میں آتا ہے یعنی ایک چیز سے بھاگنا اور نفر لڑائی میں نکلنے کو بھی کہتے ہیں اور نَفَرَ خدا کی راہ میں علم سیکھنے کے لیے نکلنے کو بھی کہتے ہیں جیسے: ﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبة: 9:122] ''تو کیوں نہ ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے، تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں۔''

ثُبَاتٍ۔ ثُبَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک منفرد جماعت یا گروہ باقی سے الگ کیا گیا۔ (غ) اس کا مادہ ثَوْبٌ ہے جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں۔ اسی مادہ سے مَثَابَةٌ کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد ان کے اجتماع کا مقام اسی سے ثُبَةٌ ہے۔ (ل)

دشمن کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ضرورت:

مومنوں کو یہ بتا کر کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں ان کے لیے کیسی کیسی برکات ہیں۔ اب اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ سخت ترین حکم جس کی اطاعت کے لیے تم کو بلایا جاتا ہے وہ جنگ کا حکم ہے۔ لیکن وہ بھی تمہاری اپنی بہتری کا ہی موجب ہے۔ کیونکہ دشمن تم کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے اس لیے تم کو ہر طرح پر اپنا بچاؤ کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ تو سب سے پہلی آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان کرلو۔ قرآن کریم الفاظ ایسے اختیار فرماتا ہے کہ وہ جنگ اور صلح دونوں حالتوں پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ اس حکم کے نزول کے وقت چونکہ دشمن نے تلوار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہا اس لیے اسلحہ یعنی ہر قسم کے سامان حرب کی تیاری ہی ضروری تھی اور آئندہ بھی ضروری رہے گی۔ لیکن جہاں جیسا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو قلم یا زبان یا تدابیر سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو اس وقت بالمقابل تیاری بھی انہی چیزوں کی چاہیے۔ مقابلہ تو کسی نہ کسی رنگ میں قیامت تک لگا ہی رہے گا۔ پس جیسا مقابلہ ہے ویسی ہی تیاری کی ضرورت ہے اور اسی قسم کی احتیاط بکار ہے۔ اب مذہب پر حملہ ہے تو اسی رنگ میں مسلمانوں کو بھی مقابلہ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں اگر مسلمان سلطنتیں ایک طرف سامان جنگ وفوج کی تیاری سے حد درجہ غافل ہیں تو مسلمان علماء دوسری طرف دین پر حملوں سے لاپرواہیں۔

اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾

کو مصیبت پہنچے کہتا ہے اللہ نے مجھ پر انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ (688)

وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾

اور اگر تم کو اللہ کی طرف سے فضل پہنچے تو بول اٹھتا ہے گویا کہ تم میں اور اس میں کوئی دوستی نہ تھی، اے کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا۔ (689)

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

سو چاہیے وہ لوگ اللہ کے رستہ میں جنگ کریں جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچتے ہیں۔ اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے پھر قتل کیا جائے یا غالب آجائے تو ہم اس کو جلد بڑا اجر دیں گے۔ (690)

688- لَيُبَطِّئَنَّ۔ يُبَطِّئُ۔ بَطْءٌ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں چلنے میں جلدی نہ اٹھنا، بلکہ پیچھے رہ جانا۔ (غ) اور اسراع یعنی جلدی چلنے کا نقیض ہے اور بَطَاءٌ متعدی بھی ہوسکتا ہے اور لازم بھی یعنی دوسروں کو پیچھے رکھنا یا خود پیچھے رہ جانا اور چونکہ یہاں مفعول مذکور نہیں اس لیے لازم ہی لیا جائے گا۔

689- ﴿كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ﴾ جملہ معترضہ ہے۔ کیونکہ اس کا یہ کہنا ﴿يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ﴾ ''اے کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ گویا ظاہر کرتا ہے کہ اس میں اور تم میں کوئی تعلق محبت نہ تھا۔ یہاں باوجودیکہ مومنوں کو کامیابی ہوئی ہے لیکن اس شخص کے اس قول کو کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا محل اعتراض ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دنیا کا مال حاصل کر لینا کوئی کامیابی نہیں۔

690- چونکہ پچھلی دو آیتوں میں کچھ کم ہمتوں کا یا دو دِلے لوگوں کا ذکر کیا تھا اس لیے اب یہاں ان کا ذکر کرتا ہے جو سب کچھ اللہ کی راہ میں دے چکے ہیں اور اپنا کچھ بھی باقی نہیں رکھا اور بتانا یہ مقصود ہے کہ ان کی غرض دنیوی کوئی باقی نہیں رہی حتی کہ جنگ کرنے میں بھی ان کی کوئی غرض دنیوی باقی نہیں۔ نہ وہ اپنی فتح کا نقارہ چاہتے ہیں نہ کسی مال غنیمت کے طالب ہیں۔ بلکہ پہلے وہ دنیا کے سارے سامان کو خدا کی راہ میں دے چکے ہیں۔ یہ کتنی کڑی مشکل ہے، خدا کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے بلایا ہی اسے جاتا ہے جو اپنا سب کچھ خدا کے لیے قربان کر چکا ہو۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝۷۵

اور تمہیں کیا (عذر) ہے کہ تم اللہ کے رستے میں جنگ نہ کرو اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے و الے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی ولی بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار بنا۔ (691)

مال غنیمت کا حاصل کرنا غرض جنگ نہ ہو:

مال غنیمت کے خیال سے جنگ کرنا تو ایک طرف رہا جنگ جیسی خطرناک چیز کو کس قدر نفسانی خیالات سے پاک کیا ہے قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی اس بات کی تصریح ہوتی ہے۔ مثلاً احد کی جنگ میں جب تیراندازوں کے ایک حصہ نے مال غنیمت کی خاطر اپنی جگہ کو چھوڑ دیا تو ان کے ذکر میں فرمایا ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا﴾ [آل عمران: 152:3] ''تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے۔'' یہ دنیا طلبی تھی جو مسلمانوں کو شایاں نہ تھی۔ ایسا ہی احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کتاب الجہاد میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے [وَهُوَ يَبْتَغِي عَرَضًا مِنْ اَعْرَاضِ الدُّنْيَا] (سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب فِي مَنْ يَغْزُو وَيَلْتَمِسُ الدُّنْيَا: 2518) اور وہ کچھ دنیا کی غرض بھی رکھتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا [لَا أَجْرَ لَهُ] اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔

691- مَا لَكُمْ کے معنی تو یہی ہیں کہ تمہیں کیا ہوا، یا تمہیں کیا عذر ہے؟ مگر اصل غرض استفہام کی تحریص ہے اور یہ بتانا ہے کہ اب ترک جنگ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔

اَلْمُسْتَضْعَفِيْنَ۔ ضُعْفٌ سے ہے جو خلاف قوت ہے اور کمزور کو ضعیف کہتے ہیں۔ اور اِسْتَضْعَفْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اس کو کمزور پایا۔ ترکیب میں یا تو مُسْتَضْعَفِيْنَ مجرور ہے اور مراد ہے [فِيْ سَبِيْلِ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ] یا [فِي خِلَاصِ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ] یعنی کمزوروں کی خاطر یا کمزوروں کی خلاصی کے لیے اور یا [مَنْصُوْبٌ عَلَى الْاِخْتِصَاصِ] یعنی بالخصوص کمزور لوگ جو ایسا ایسا کہتے ہیں۔

اَلْوِلْدَانُ۔ وَلِيْدٌ کی جمع وِلْدَانٌ آتی ہے۔ بعض کے نزدیک وَلَدٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور وَلِيْدٌ اصل معنی کے لحاظ سے نئے پیدا شدہ بچے اور بڑے پر یکساں استعمال ہوسکتا ہے۔ گو عام طور پر نئے پیدا شدہ پر بولا جاتا ہے۔ (غ) اور وَلِيْدٌ لڑکے کو بھی کہا جاتا ہے اور غلام کو بھی۔ اس لیے بعض نے یہاں وِلْدَانُ سے غلام اور لونڈیاں مراد لی ہیں۔ مگر لڑکے مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں اس لیے کہ چھوٹے بچوں پر ظلم کیا جاتا تھا اور دعا کرنے میں چھوٹے بچوں کے شامل ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں۔ یہ صورت

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَ	جو ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو
الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ	کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس تم
الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ	شیطان کے مددگاروں سے جنگ کرو شیطان کی جنگ
ع 10 6 7 كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾	یقیناً کمزور ہے۔ (692)

حال کا بیان ہے۔ یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ ان پر دعا کرنا فرض تھا۔

﴿هٰذِهِ الْقَرْیَةِ﴾ اشارہ مکہ کی طرف ہے جہاں اب تک مسلمانوں پر ظلم ہو رہے تھے جو وہاں سے بوجہ کمزوری کے ہجرت نہ کر سکتے تھے کیونکہ کفار مانع تھے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ **جنگ کرنے کی بڑی بھاری ضرورت کیا ہے**۔ سو اول تو اس کو فی سبیل اللہ کہہ کر بتایا کہ جنگ کی ضرورت دین الٰہی کی حفاظت ہے کیونکہ مخالف اس کو تلوار سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے اور دوسری ضرورت یہ بتائی کہ کمزور مرد، عورتیں، بچے اہل مکہ سے دکھ اٹھا رہے ہیں اور ان پر مظالم ہو رہے ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ ہجرت کر سکیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بخاری میں ہے کہ میں اور میری ماں مستضعفین میں سے تھے۔ سلمہ بن ہشام، ولید بن ولید اور ابو جندل کے نام بھی بعض روایات میں آئے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر کس قدر ظلم تھا کہ باوجودیکہ ان کا بیشتر حصہ اب مدینہ میں جا چکا تھا مگر پھر بھی جو بعض کمزور لوگ یا عورتیں یا بچے رہ گئے تھے وہ بھی ان کے ظلم کا تختۂ مشق ہو رہے تھے۔ ولی اور نصیر کے الگ الگ لانے میں یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ ولی تو محض حفاظت کے لیے بکار ہوتا ہے اور نصیر وہ ہے جو مدد دے کر ظلم سے ہمیشہ کے لیے چھڑا دے۔ جیسے ﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ﴾[آل عمران: 147:3] ''اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔'' سے ظاہر ہے۔ بعض کے نزدیک وَلِیًّا سے مراد ولایت اور نَصِیْرًا سے مراد نصرت ہے اور جناب الٰہی سے ولایت و نصرت مانگنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ولی و ناصر ہو۔

692- **یہاں مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا قطعی فیصلہ کیا ہے**۔ مومن اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں لیکن اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس لیے جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا وہ بھی جنگ کے ذریعہ سے کسی پر ظلم کرنا روا نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ سب مخلوق کو یکساں رزق دیتا ہے اور یکساں حقوق اس نے سب کو دیئے ہیں اس لیے جو اس کی راہ میں جنگ کرے گا وہ دوسروں کے حقوق کو دبانے کے لیے کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اس لیے خدا کی راہ میں جنگ کرنے والا کسی فساد کی خاطر جنگ نہیں کر سکتا۔ طاغوت کے معنی ہی سرکشی کرنے والا یا حدبندیوں سے نکلنے والا ہیں۔ اس لیے یہاں [فِیْ سَبِیْلِ الشَّیْطَانِ] نہیں فرمایا بلکہ ﴿فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ﴾ فرمایا حالانکہ ساتھ ہی دوسری جگہ ﴿فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ﴾[النساء: 76:4] ''پس تم شیطان کے مددگاروں سے جنگ کرو۔'' اور ﴿كَیْدَ الشَّیْطٰنِ﴾ کے لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ گویا مراد طاغوت اور شیطان سے ایک ہی ہیں۔ لیکن فی سبیل الطاغوت کہنے میں اشارہ یہ ہے کہ کافر حدبندیوں سے نکلنے کے لیے زیادتی اور ظلم کے لیے جنگ کرتے ہیں

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ

کیا تم نے ان (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کہا گیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ (693) پھر جب ان پر جنگ ضروری ٹھہرائی گئی

گویا ان کی غرض جنگ سے یہ ہے، ان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی جس کے دور کرنے کے لیے جنگ کرتے ہوں۔ بلکہ ایک امن سے رہنے والی قوم پر ظلم اور زیادتی کرنے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔

اس آیت میں یہ پیشگوئی صریح الفاظ میں ہے کہ **کفار جنگ میں مغلوب ہوں گے** کیونکہ آخر پر فرمایا کہ شیطان کی جنگ کمزور ہے۔ کَیْدَ کے لیے [دیکھو نمبر: 507]۔ حالانکہ اس وقت تو کفار کا سخت غلبہ تھا بلکہ سارا ملک ہی مٹھی بھر مسلمانوں کے خلاف تلا ہوا تھا۔ پس یہاں شیطان کی جنگ کو کمزور کہنے سے اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے یعنی انجام کار کمزور ثابت ہوگی۔ اس میں یہ بھی بتایا کہ ظلم اور زیادتی اگر غالب بھی ہوں تو چند روز کے لیے ہوتے ہیں۔

693- **اصلاح نفس جہاد پر مقدم ہے:** اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ منافق لڑائی میں نکلنے سے ڈرتے ہیں۔ ہاتھوں کو روکنے اور نماز کو قائم کرنے کا حکم تو عام ہے یعنی سب مسلمانوں کو، مگر ڈرنے والا اور باتیں بنانے والا گروہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ منافقوں کا ہے۔ اور ان کو ﴿فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ اس لیے کہا کہ بظاہر منافق مسلمانوں کے اندر ہی ملے ہوئے تھے لوگوں سے اس طرح ڈرنے والے جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے۔ متاع دنیا کی آرزو کرنے والے۔ پھر [آیت: 81] کے راتوں کو مشورہ کرنے والے مومن نہیں ہو سکتے۔ اور یہ جو کہا گیا کہ ہاتھوں کو روک رکھو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو یہ حکم تھا کہ جب تک دشمن جنگ میں ابتدا نہ کرے اس وقت تک جنگ نہ کریں۔ اس لیے جب تک دشمن نے پہل نہیں کی آپ کو یہی ہدایت تھی کہ جنگ نہ کی جائے اور اس کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم ملانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جنگ اسلام کی اصل غرض نہیں بلکہ ضرورت وقتی ہے اور اصل غرض جس کے لیے نبی آتا ہے تکمیل نفس انسانی ہے۔ اس لیے جن باتوں سے تکمیل نفس انسانی ہوتی ہے انہیں اختیار کیا جائے یعنی نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ جنگ سے رکنے اور نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کا اکٹھا بیان کر کے یہ بتا دیا کہ انسان کے لیے دو جہاد ہیں۔ ایک جہاد اصلاح نفس کے لیے دوسرا حفاظت دین کے لیے۔ ان میں جہاد اصلاح نفس مقدم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس وقت دی اور وہ بھی مشروط جب پہلے ان کو اصلاح نفس کے جہاد میں کامیاب ثابت کر دیا۔ نماز یا عبادت سے انسان کے اندر فروتنی اور نرمی کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ سے انسانی ہمدردی قوت پکڑتی ہے۔ جو قومیں اپنی تکمیل نفس کے بغیر جنگوں میں پڑ گئی ہیں ان میں صرف اخلاق خشونت ہی پرورش پاتے رہے اور نرمی اور فروتنی کے اخلاق بالکل دب گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ظلم، خونخواری، محکوم کو ذلیل حالت میں رکھنا، انتقام کی سخت خواہش یہ باتیں ان کے اخلاق میں پیدا ہو گئیں۔ یہی نقشہ آج کل کی برائے نام مہذب اقوام میں بھی ہم کو نظر آتا ہے، جو جہاں تک دوسری قوموں سے تعلقات کا سوال ہے حقیقی اخلاق سے محروم ہیں۔ وہ دنیوی فوائد ان سے جس قدر چاہیں اٹھالیں

مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ

توان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اور بولے اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ کرنا کیوں ضروری ٹھہرایا؟ کیوں تھوڑی مدت تک ہم کو ڈھیل نہ دی؟(694) کہہ دنیا کا سامان تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر

مگر اخلاق میں ان کے معلم نہیں ہو سکتے اور نہ محکوم قوموں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت ہو سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اعتدال اور میانہ روی کی حالت پر رکھنا تھا اور ان کو دنیا میں اخلاق کے معلم بنانا تھا اس لیے پہلے ان کے نرمی اور فروتنی کے اخلاق کو کمال کو پہنچایا اور جب مصائب برداشت کرتے کرتے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور انسانوں کی ہمدردی کرتے کرتے ان میں نرمی اور محبت کے اخلاق کمال کو پہنچ گئے تب جنگ کی اجازت دی گئی۔ پس مسلمان سپاہی کو جنگ کے لیے تیار کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو ضروری ٹھہرایا۔ آج جو لوگ قوم کو ذلت کی حالت سے نکالنا چاہتے ہیں ان کے لیے ان الفاظ میں صحیح ہدایت موجود ہے اگر وہ غور کریں۔ محض حصول سوراج کے پیچھے پڑ جانا اور اصل غرض کو جو اقامت الصلوٰۃ اور زکوٰۃ کا دینا تھا ایسا پس پشت ڈالنا کہ ان باتوں کا تقریروں اور لیکچروں میں نام بھی نہ آئے اس میں اور جس کی چاہے پیروی ہو۔ قرآن کی پیروی نہیں۔ اسلام کی غرض تکمیل نفس انسانی ہے اس کے دو ہی بڑے عملی ستون ہیں نماز اور زکوٰۃ جو سب سے پہلے ان کی تعمیر کا فکر نہیں کرتا اس کا قدم صحیح راہ پر نہیں اور نماز اور زکوٰۃ میں غفلت قوم کو عملی منافقت کی حالت سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

694- ﴿كَخَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ یعنی جس طرح ایک مومن خدا سے ڈرتا ہے کہ اگر اس نے بدی کی، اس کو ترک نہ کیا تو انجام ہلاکت ہے۔ اسی طرح یہ منافق لوگوں سے خائف تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (اَوْ بمعنی بَلْ بھی آتا ہے) کیونکہ مومن کے لیے خوف اور رجا دونوں ہیں۔ یعنی اگر وہ ایک طرف بدی کی ہلاکت سے خائف ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت پر بڑی بڑی امیدیں بھی رکھتا ہے۔ مگر منافقوں کے لیے سوائے خوف کے کچھ بھی نہ تھا اس لیے وہ ان کا خوف بڑھتا ہی جاتا تھا کہ آج مارے گئے یا کل۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا ﴿يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ﴾ [المنافقون: 4:63] ''وہ ہر زور کی آواز کو اپنے اوپر (تباہی) خیال کرتے ہیں۔''

جب نرم دلی اور محبت کے اخلاق مسلمانوں کے اندر خوب پرورش پا چکے اور مصائب کی چکی میں وہ خوب پس کر ایک کمال انسانی کو حاصل کر چکے تو اب وہ وقت آ گیا کہ جنگ ان کے لیے ضروری ٹھہرائی گئی۔ کیونکہ اب کفار نے اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے تلوار ہاتھ میں اٹھالی۔ مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دشمن کی قوت کو دیکھ کر اس سے مرعوب تھے اور مرعوب بھی اس قدر کہ وہ سمجھتے تھے کہ اب دشمن ہم کو بالکل تباہ ہی کر دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت کس قدر تھی اور ایسے حالات میں

الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

ہے جو تقویٰ کرے اور تم پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔(695)

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ

جہاں کہیں تم ہو گے موت تمہیں آلے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں (کیوں نہ) ہو۔(696) اور اگر ان کو بھلائی پہنچتی ہے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو دکھ پہنچتا ہے، کہتے ہیں یہ تیری وجہ سے ہے۔ کہہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

مال غنیمت کے لالچ سے مسلمانوں کا جنگ کرنا محض ایک کہانی ہے جس کی ذرہ بھی اصلیت نہیں۔ مال غنیمت کیا یہاں تو جان بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

695- اس حصہ میں بتایا کہ حق کی حفاظت اور حمایت کے لیے لڑتے ہوئے مرجانا اس ذلیل زندگی سے بہتر ہے جس میں صرف یہی غرض ہو کہ دنیا کا کچھ مال کما لیا جائے۔ حفاظت حقوق کے سامنے مال دنیا کی کچھ عزت نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ ظلم نہیں ہوگا یعنی جو کچھ دنیوی آرام یا مال یا مفاد حق کی خاطر ترک کرو گے تو وہ قربانی ضائع نہ ہوگی۔

696- بُرُوْجٍ۔ بُرْجٌ کی جمع ہے اور وہ اصل میں ہر ظاہر مرتفع کو کہا جاتا ہے اور شہر کے برج اس کے قلعے ہیں جو شہر کی فصیل پر بنائے جاتے ہیں اور آسمان میں جو بروج کا ذکر ہے ﴿وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝﴾[البروج: 85:1] ''ستاروں والا آسمان گواہ ہے۔'' ﴿جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا﴾[الفرقان: 61:25] ''آسمان میں ستارے بنائے۔'' تو وہ کواکب یعنی ستارے ہیں۔ اور قصر یعنی محل کو بھی برج کہا جاتا ہے۔ (ت) اسی مادہ سے عورت کا تبرج اپنے محاسن کو ظاہر کرنا ہے۔ یہاں بروج سے مراد قلعے ہیں۔

مُّشَيَّدَةٍ۔ شِيْدٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ہر ایک چیز جس سے دیوار مزین کی جائے چونہ ہو یا پتھر اور [تَشْيِيْدُ الْبِنَاءَ] سے مراد عمارت کا مضبوط کرنا اور بلند کرنا ہے۔ (ل) دوسری جگہ ﴿قَصْرٍ مَّشِيْدٍ﴾[الحج: 22:45] ''اور پکے محل'' آتا ہے اور وہ واحد کے لیے ہے۔ (ل)

فرائض کی ادائیگی میں موت سے خائف نہ ہو:

یہاں ﴿لَوْ لَآ اَخَّرْتَنِيْٓ﴾ کا جواب دیا ہے اور وہ عام الفاظ میں ہے یعنی اگر جنگ میں مرنے سے بچ بھی جاؤ تو آخر موت سے تو نہیں بچ سکتے۔ خواہ زندگی کے لیے کتنی ہی حفاظت کے سامان بنا لو حتی کہ بڑے بڑے مضبوط اور بلند قلعوں میں پناہ گزین ہو جاؤ اس کا یہ منشا نہیں کہ زندگی کی حفاظت نہیں کرنی چاہیے۔ زندگی خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیے۔

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾

پھر ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔(697)

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ

(اے انسان) جو کوئی بھلائی تجھے پہنچتی ہے سو وہ اللہ سے ہے اور جو دکھ تجھے پہنچتا ہے تو وہ تیرے ہی نفس سے ہے۔(698) اور ہم نے تجھے سب لوگوں (کی بھلائی) کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے

مگر تقویٰ یہ ہے کہ جو فرائض اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمہ ڈالے ہیں، ان کی ادائیگی کے لیے بڑی سے بڑی نعمت الٰہی کو بھی قربان کر دے۔ فرائض کی ادائیگی کے وقت موت سے خائف ہونا کم ہمتی اور نامردی ہے۔

697- حَسَنَةٌ ہر ایک وہ چیز ہے جو انسان کو خوش کرے اور دنیوی اور دینی بھلائی دونوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سَيِّئَةٌ اس کی ضد ہے یعنی جو چیز انسان کو غم میں ڈالے، امور دنیوی سے ہو یا اخروی سے۔ [دیکھو نمبر: 105، 507]۔

بھلائی اور دکھ اللہ کی طرف سے ہونے سے مراد:

جب جنگ اُحد میں کچھ تکلیف پہنچی تو منافقوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی سوء تدبیر سے ہے۔ کیوں باہر نکلے؟ حالانکہ اس کی اصل وجہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی تھی۔ یوں انہوں نے آنحضرت ﷺ کی نافرمانی کے لیے ایک راہ نکال لی تھی۔ چنانچہ جنگوں میں یہی ان کا وطیرہ رہا کہ جہاں دشمن کو قوی اور زبردست دیکھا وہاں پیچھے ہٹ گئے۔ جہاں مقابل پر دشمن کمزور ہوا آپ بھی قدم آگے بڑھ بڑھ کر رکھنے لگے۔ جہاں کامیابی ہوئی اور کچھ مال ہاتھ لگ گیا، کہہ دیا یہ اللہ کی طرف سے ہے ﴿هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ دوسری جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے [الأعراف: 131] کہ جب نعمت سے متمع ہوتے ہیں تو کہتے ہیں لَنَا هٰذِهٖ یہ ہمارے لیے ہے، ہم اسی کے حقدار ہیں۔ یہی مطلب یہاں ہے اور جہاں کچھ تکلیف پہنچی اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں پر جب کوئی تکلیف آتی ﴿يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ﴾ [الأعراف: 131:7] ''موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی شومی بتاتے۔'' فرمایا کامیابی ہو یا کچھ تکلیف ہو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے ہی ہے۔ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صورت میں جواب میں فرمایا ﴿اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الأعراف: 131:7] ''ان کی شومی صرف اللہ کی طرف سے ہے۔'' جس سے مراد ہے کہ یہ ان کے اپنے خیر وشر کی وجہ سے ہے یعنی اپنے اعمال سے۔ کیونکہ جو دکھ انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے ہی ہیں اسی کی زیادہ تصریح اگلی آیت میں فرمائی۔

698- **﴿مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور ﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ میں یہ فرق کیا گیا ہے** کہ ﴿مِّنَ اللّٰهِ﴾ ان امور پر بولا جاتا ہے جو اللہ کی رضا اور اس کے حکم

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ اور اللہ کافی گواہ ہے۔(699)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور جو پھر جائے تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔(700)

سے ہوں۔ اور ﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ عام ہے جو کچھ قضا وقدر ہے خواہ وہ نتیجہ اللہ کی رضا سے واقع ہو یا اس کی ناراضگی سے اور خواہ خدا نے اس کام کا حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو وہ سب ﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ہے۔ اس لیے پچھلی آیت میں فرمایا تھا ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ سب کچھ اللہ کی قضا وقدر سے ہے۔ ہاں سب کچھ اللہ کی رضا کے مطابق نہیں اس لیے یہاں فرمایا ﴿اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ کیونکہ اللہ کی رضا تو یہی ہے کہ انسان کو حسنہ یعنی بھلائی پہنچے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ [الشوریٰ: 30:42] ''اور جو تم پر مصیبت پڑتی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔'' اور فرماتا ہے ﴿وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ [الزمر: 7:39] ''وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔'' گو اس کی قضا وقدر یہ ہے کہ کافر بھی ہوں۔ پس جس راہ پر اللہ تعالیٰ انسان کو چلاتا ہے اس کا مآل حسنہ یعنی بھلائی ہے اس لیے رسول کی اطاعت سے انسان کو کبھی دکھ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ تکلیفیں جو انسان ایک غرض کے حصول کے لیے اٹھاتا ہے یا جو مومن اللہ کی راہ میں خوش دلی سے اٹھاتا ہے وہ سَيِّئَةٌ میں داخل نہیں۔ جیسا کہ ایک طالب علم کا امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے یا ایک شخص کا معاش کے لیے محنت اور مزدوری کرنا سَيِّئَةٌ میں داخل نہیں۔

699- اسی پہلی بات کی یہاں تائید کی۔ اسی لیے رسول بنا کر بھیجنے کا ذکر کیا تو اِلَى النَّاسِ نہیں فرمایا بلکہ لِلنَّاسِ فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لیے۔ پس رسول کی اطاعت میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ اللہ کافی گواہ ہے یعنی نتیجہ ظاہر کر دے گا کہ واقعی اس کے احکام کی فرمانبرداری میں تمہاری بھلائی ہے۔

700- حَفِيْظٌ۔ حِفْظٌ۔ نِسْيَانٌ کی ضد ہے اور اس قوت کے استعمال پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے اس لیے اس کے معنی تعہد اور رعایت کے ہو گئے ہیں۔ (غ) اور یہاں رسول کے حفیظ نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا کام نہیں کہ لوگوں سے اطاعت کرا بھی لے یا ان کو معاصی یا دکھوں میں پڑنے سے بچا بھی لے۔

اس آیت میں بالکل صاف کر کے بتا دیا ہے کہ **رسول اللہ ﷺ کی اطاعت خدا کی ہی اطاعت ہے**۔ پہلی آیت میں ﴿وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا﴾ فرما کر اور یہاں ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ﴾ کہہ کر واضح کر دیا کہ رسول سے مراد خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور اہل قرآن کی اس تفسیر کے لیے کہ رسول سے مراد رسالت ہے یہاں گنجائش باقی نہیں اور آپ کی اطاعت ضروری ہے اور اسی اطاعت کا ذکر ہی اس رکوع میں ہے۔ اور گو یہاں ذکر جنگ کا ہے جس سے منافق دل چراتے تھے مگر حکم عام ہے

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾

اور کہتے ہیں اطاعت (قبول ہے۔) پھر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں ان میں سے ایک گروہ رات کو اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو تو کہتا ہے۔ اور اللہ لکھ لیتا ہے جو یہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں۔ سو ان کا کچھ خیال نہ کر اور اللہ پر بھروسہ کر اور اللہ کافی کارساز ہے۔ (701)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

پھر کیا قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔ (702)

رسول ﷺ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کہہ کر بتا دیا کہ جو کچھ حکم نبی کریم ﷺ دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ بات اللہ تعالیٰ بذریعہ جبریل علیہ السلام قلب رسول ﷺ پر نازل کرے یعنی وحی متلو ہو یا آپ کے دل میں ڈال دے یعنی وحی خفی ہو۔

701- بَيَّتَ۔ بَاتَ کے معنی ہیں رات کاٹی اور بَيَّتَ کے لیے [دیکھو نمبر: 157] اور بَيَاتٌ کے معنی ہیں رات کے وقت دشمنی کا قصد کرنا ﴿يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا﴾ [الأعراف: 7:97] ''ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آئے۔'' اور ہر ایک فعل جس کے متعلق رات کو تدبر کیا جائے اس پر بَيَّتَ بولا جاتا ہے۔ (غ)

معلوم ہوا کہ یہ ذکر منافقوں کا ہی چلا آتا ہے کیونکہ مومن آنحضرت ﷺ کے خلاف راتوں کو مشورے نہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ان مشوروں کو محفوظ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ ان منصوبہ بازیوں کی سزا ان کو ضرور مل کر رہے گی اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت میں اشارہ ہے کہ ان کے مشوروں سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

702- يَتَدَبَّرُوْنَ۔ دُبُرٌ پیٹھ کو کہتے ہیں اس لیے اِدْبَارٌ کے معنی پیٹھ پھیرنا آتے ہیں ﴿مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى﴾ [المعارج: 70:17] ''جو پیٹھ پھیر لیتا ہے اور پھر جاتا ہے۔'' اور تدبیر کے معنی ہیں [اَلتَّكْفِيْرُ فِيْ دُبُرِ الْاُمُوْرِ] (غ) یعنی امور کے نتائج میں فکر کرنا۔

رسول اللہ ﷺ کے حالات میں اختلاف کثیر کے باوجود قرآن میں اختلاف نہ ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل ہے:

یہ جو کچھ منصوبے منافق کرتے تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان نہ لاتے تھے بلکہ خیال کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ ﷺ خود ہی باتیں بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کو قرآن شریف میں تدبر کرنے کو کہا ہے اور فرمایا ہے اگر قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کو

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اور جب کوئی امن یا خوف کی بات ان کو پہنچتی ہے تو اس کو

اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ ایک منصوبہ باز انسان ان مختلف حالات میں ایک حالت پر نہ رہ سکتا تھا بلکہ آج اگر ایک تجویز اپنی کامیابی کی سوچتا تو کل دوسری اور آج اگر ایک خیال اس کے دل میں موجزن ہوتا تو کل دوسرا۔ ایک طرح پر منافقوں کو ان کی اپنی حالت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح ان کے اپنے حالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور یہ منصوبہ بازیوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی حالت پر غور کرو کہ کس طرح ایک زمانہ آپ پر وہ ہے کہ آپ اکیلے غار حرا میں مخلوق خدا کی بہتری کے لیے آہ وزاری کرتے ہیں تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ آپ اب مدینہ میں ایک چھوٹی سی ریاست کے بادشاہ ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ ہے کہ چاروں طرف آپ کی صداقت اور راستبازی کا شہرہ ہے تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ سب لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور کوئی بات تک نہیں سنتا۔ کبھی چاروں طرف سے دکھوں اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے ہیں تو دوسرے وقت چاروں طرف جاں نثار موجود ہیں۔ کبھی دشمن آپ کو نقصان پہنچا جاتے ہیں تو کبھی آپ فاتح اور غالب ہوتے ہیں۔ ایک وقت اگر امام نماز بن کر ساتھیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ منازل روحانی کی سیر کراتے ہیں تو دوسرے وقت جرنیل بن کر مشکل سے مشکل مقامات میں سے اپنی فوج کو نکال کر ان کو میدان جنگ میں فاتح کے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ کبھی عدالت کا کام آپ کے سپرد ہے تو کبھی قانون سازی بھی آپ کو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ ابھی بادشاہ کی حیثیت میں اختیار حکومت کو برت رہے ہیں تو دوسرے لمحہ میں دوستوں کے اندر اس قدر انکساری سے بیٹھے ہوئے ہیں کہ آپ کو کوئی پہچان بھی نہیں سکتا۔ ابھی وعظ و نصیحت میں مصروف ہیں تو ابھی گھر میں بی بی کو کسی کام میں مدد دے رہے ہیں۔ اور ان تمام حالات متفرقہ میں قرآن کریم آپ پر نازل ہوتا رہتا ہے۔ منصوبہ باز انسان کی حالت ایسے اوقات میں لازماً بدلتی رہتی ہے اور اس کے خیالات میں بھی اسی طرح تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ مگر قرآن کریم کو اول سے آخر تک پڑھ جاؤ وہ سب کا سب ایک ہی رنگ میں رنگین اور ایک ہی اثر سے متاثر ہے اس کے خیالات میں باوجود اختلاف مضامین کے ایک ہی رَو دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے تاریخی بیانات میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔ اس کے نظم میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ اس کے احکام میں کوئی متضاد امر نہیں۔ اس کی فصاحت و بلاغت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس آیت میں منافقوں پر ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کے کل مخالفین پر اتمام حجت کیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اختلاف کا نہ ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے پر ایک قطعی دلیل ہے اور یہ اختلاف کا نہ ہونا نہ صرف ان حالات مختلفہ کے لحاظ سے اپنے اندر ایک اعجاز کا رنگ رکھتا ہے جن میں سے آنحضرت ﷺ کو تیئیس سال کے عرصہ میں گزرنا پڑا۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آنحضرت ﷺ امی تھے۔ لیکن دنیا کے سارے مذاہب پر قرآن شریف میں بحث ہے۔ کبھی ان مذاہب کے پیرو آپ کی دوستی کا دم بھرتے ہیں کبھی سخت ترین دشمن ہیں۔ مگر قرآن کریم نے جو پہلو ان کے متعلق ایک دفعہ اختیار کیا وہی آخر تک قائم رکھا۔ پھر آپ نے ان کی کتابوں کو پڑھا نہیں بایں ہمہ مکی اور مدنی دونوں سورتوں میں کثرت کے ساتھ ان کی تاریخ کے حوالہ جات پائے جاتے ہیں۔ کس قدر کمال ہے کہ ان واقعات میں نہ باہم کوئی اختلاف ہے۔ نہ صحیح تاریخ سے اختلاف ہے۔ مسیح کے حالات کو چار انجیل

اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ

پھیلاتے ہیں۔اور اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے صاحبان امر کی طرف لوٹاتے تو اسے وہ جان لیتے جو ان میں سے بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔[703] اور اگر تم پر

نویس جو ملہم مانے جاتے ہیں لکھنے بیٹھتے ہیں تو باہم اس قدر اختلاف ہوجاتا ہے کہ مسیح کے نسب نامے تک نہیں ملتے۔اور صریح متضاد بیانات ان اناجیل میں موجود ہیں' یہ لکھے پڑھے ملہمین کی حالت ہے۔مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے امی ہونے کے باوجود توریت اور انجیل کے بکثرت حوالہ جات قرآن کریم میں موجود ہیں پھر ان میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ جہاں بائبل اور قرآن کا اختلاف ہے وہاں آج واقعات کی شہادت سے حق قرآن کریم کے ساتھ ثابت ہورہا ہے۔جس کی مثالیں اپنے اپنے موقعہ پر ان نوٹوں میں دی جاچکی ہیں اور قرآن کریم کا مشہور جرمن منقد ہرشفلڈ جس نے بڑے غور سے قرآن شریف کو پڑھا ہے توریت و انجیل کے مضامین کے حوالہ جات کی کثرت کو قرآن کریم میں دیکھ کر یہاں تک گھبرایا ہے کہ اس کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بڑے غور سے ان کتابوں کو پڑھ کر ان کے مضامین کو ایک نوٹ بک میں لکھ لیا تھا اور بطور اشارۃ قرآن کریم میں ان کو لاتے رہے۔پھر بائبل کے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے پیغمبروں کا ذکر بھی قرآن کریم میں آیا ہے مگر وہ بھی اختلاف سے اسی طرح پاک ہے۔غرض کہ یہ ایک بے نظیر اعجاز قرآن کریم کا ہے۔

قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا ناسخ منسوخ کو غلط ٹھہراتا ہے:

ساتھ ہی ان الفاظ میں ان مسلمانوں پر بھی اتمام حجت کیا ہے جو قرآن کریم میں نسخ کے قائل ہوئے ہیں اس لیے کہ نسخ کو قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ قرآن شریف کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ تطبیق نہیں دی جاسکتی جس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن کریم میں اختلاف ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔پس قرآن کریم میں نسخ کا قبول کرنا قرآن کریم کے اس صریح دعویٰ کے خلاف ہے جو یہاں کیا گیا ہے اور یہاں ایک اور بھی لطیف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہاں جب قرآن میں اختلاف نہ ہونے کا دعویٰ کیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے؟ اگر تدبر کریں تو معلوم ہوگا کہ اختلاف کوئی نہیں اور یہی سچ ہے۔کیونکہ کوئی بھی آیت جس کی منسوخی کا ایک گروہ قائل ہوا ہو ایسی نہیں جس کی عدم منسوخی کا دوسرا قائل نہ ہو۔کیونکہ اس دوسرے کے نزدیک تدبر کرنے سے دونوں آیات میں تطبیق ہوگئی۔پس قرآن کریم کا دعویٰ ثابت شدہ ہے اور جہاں سطحی نظر سے اختلاف معلوم ہوتا ہے وہیں تدبر کرنے سے وہ اختلاف دور ہوجاتا ہے۔

703- يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ۔ اِسْتِنْبَاطٌ کا اصل نَبَطَ سے ہے اور نَبَطَ الْبِئْرَ کے معنی ہیں کنوئیں کو کھود کر اس کا پانی نکالا۔اسی سے فقیہ کا استنباط ہے جب وہ اپنے فہم اور اجتہاد سے مخفی معنی کو نکال لیتا ہے اس لیے استنباط کے معنی استخراج ہیں۔(ت) یا ایک بات کی تہہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ نکال لینا۔یہاں اولی الامر کے ساتھ استنباط کا لفظ لاکر بتادیا کہ اصطلاح قرآن میں اولی الامر سے مراد صرف صاحب حکومت نہیں بلکہ فقہا اور آئمہ اور مجتہدین بھی اس میں داخل ہیں۔

عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑوں کے سوائے تم ضرور شیطان کے پیچھے لگے رہتے۔ (704)

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

پس اللہ کی راہ میں جنگ کر تجھے اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لیے مکلف نہیں کیا جاتا اور مومنوں کو بہت ترغیب دے قریب ہے کہ اللہ ان کی جنگ کو روک دے جو کافر ہیں اور اللہ طاقت میں سب سے زیادہ قوی اور عبرتناک سزا دینے میں سخت تر ہے۔ (705)

پچھلی آیت گویا ایک جملہ معترضہ کے طور پر تھی۔ اب پھر منافقوں کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ کوئی بات امن کی ہو۔ یعنی حالات عامہ کے متعلق یا خوف کے متعلق یعنی دشمن کی چڑھائی وغیرہ کے تو یہ لوگ اسے بہت پھیلاتے ہیں تاکہ بدامنی پھیلے حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ ایسی باتوں کو اولی الامر کی طرف لوٹاتے، جو قوت استنباط رکھتے ہیں۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کے اہل بھی وہی لوگ ہیں جو قوت استنباط کو کام میں لا سکتے ہیں یعنی بعض حالات سے ایک صحیح نتیجہ نکال سکتے ہیں۔

اس آیت میں مسائل شرعی میں **استنباط کا مسئلہ** بھی نکلتا ہے۔ کیونکہ استنباط مسائل یہی ہے کہ ایک مسئلہ کا صریح حکم موجود نہیں ہوتا یعنی صورت پیش آمدہ میں کچھ حالات مختلفہ جمع ہوتے ہیں ان کو قرآن شریف اور سنت پر پیش کر کے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔

704- اللہ کا فضل اور رحمت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہی ہے یہ اخلاق رذیلہ جن کا نظارہ منافقین میں نظر آتا تھا دور نہ ہوتے اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مکارم اخلاق کے ساتھ مبعوث فرما کر ان کا علاج نہ کیا ہوتا۔ یا منافقین کے انجام کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی فضل کرے گا اور تم میں سے بہتوں کو شیطان کی پیروی سے نکال دے گا۔ ورنہ تم ایسی غلط راہ پر پڑے تھے کہ اس سے نکلنا مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہاری دستگیری فرما کر تم میں سے اکثر کو اس حالت سے باہر نکال دے گا ﴿اِلَّا قَلِيْلًا﴾ کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں۔ یوں بھی کہ تھوڑوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے اور یوں بھی کہ تھوڑی صورتوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے۔

705- حَرِّضِ۔ حَرَضَ وہ ہے جو کسی گنتی میں نہ ہو اور جس میں کچھ بھلائی نہ ہو اس لیے جو ہلاکت کے قریب پہنچ جائے اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ﴿حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا﴾ [یوسف: 85:12] ''یہاں تک کہ تو مرنے کے قریب ہو جائے۔'' اور تحریض کے معنی ہیں ایک چیز کی خوبیوں کو بکثرت بیان کر کے اس پر تحریض دلانا گویا اس میں حرض کا ازالہ ہے۔ (غ)

تَنْكِيْلٌ۔ نَكَلَ سے ہے جس کے معنی قید ہیں اور تَنْكِيْلٌ اور نِكَالٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسی سزا دینا جس سے دوسرے کو

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

جوکوئی بھلی بات سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا اور جوکوئی بری بات کی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھنے والا ہے۔ (706)

ایسا فعل کرنے سے روک دیا جائے یا عبرتناک سزا۔ [دیکھو نمبر: 95]

جنگ کے لیے آنحضرت ﷺ اکیلے مکلف تھے:

چونکہ منافقوں کے جنگ کے وقت پیچھے رہنے کا ذکر تھا اس لیے فرمایا کہ تمہارا جنگ کرنا تو دین اسلام کی حفاظت کے لیے ہے۔ پس کوئی اور کرے یا نہ کرے تم اکیلے ہی جنگ کرو۔ ہاں مومنوں کو بھی ترغیب دو۔ مگر مکلف تم اپنی ذات کے لیے ہو۔ دوسروں کے لیے تم مکلف نہیں۔ یعنی ان کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ اکیلے جنگ کرنے کا حکم بتاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا بھروسہ تعداد پر نہ تھا بلکہ نصرت الٰہی پر تھا۔ لکھا ہے کہ جنگ احد کے بعد جب لوگ بوجہ مصیبت اور تکلیف پیش آنے کے بہت پژمردہ ہو رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اکیلا ہی دشمن کے تعاقب میں نکلوں گا۔ یہ آپ کا عزم تو آپ کی شجاعت پر دلالت کرتا ہے کہ قوت قلبی کس قدر تھی۔ مگر جان نثاروں کا گروہ آپ کو تنہا کب چھوڑتا تھا۔ یہاں ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ کافر اس جنگ کو جو اسلام کے خلاف انہوں نے کی ہے جاری نہ رکھ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ آخر کار ان کو مغلوب کر کے روک دے گا اور جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

706- يَشْفَعْ۔ شَفِعَ کے لیے اور شفاعت کے لیے [دیکھو نمبر: 71]۔ یہاں مراد ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ مل جائے اور اس کی اچھی یا بری بات میں مدد کرے۔ (غ) اور ایک اور قول نقل کیا ہے کہ شفاعت سے مراد یہاں یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کے لیے اچھا یا برا رستہ بنا دے جس پر وہ چلے اور یوں اس کا شفیع بن جائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا] (سنن النسائی، کتاب الزکاۃ، باب التحریض علی الصدقۃ: 2554) ''جو کوئی اچھی راہ نکالے اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس کا اجر بھی جو اس پر عمل کرے اور جو کوئی بری راہ نکالے اس پر اس کا بوجھ ہے اور اس کا بوجھ بھی جو اس پر عمل کرے۔'' (غ)

كِفْلٌ اور كَفِيْلٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسا حظ جس میں کفایت ہو گویا وہ اس کے امر کا متکفل ہو جاتا ہے ﴿يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ [الحدید: 28:57] ''تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے دے۔'' مگر امام راغب کہتے ہیں یہاں کفل کے یہ معنی نہیں بلکہ وہ اس کفل سے مستعار ہے جو ردی شے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور شدت کے معنی میں متعارف ہو گیا ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ جو برے فعل میں دوسرے کا مددگار رہتا ہے اور راستہ بناتا ہے وہ بھی اس فعل بد کے برے نتیجہ کی

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾

اور جب تم کو کسی دعا کے ساتھ دعا دی جائے تو اس سے بہتر کے ساتھ دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔ (707)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾ ع

اللہ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ ضرور تم کو قیامت کے دن تک جس میں کوئی شک نہیں جمع کرے گا اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے؟

شدت کو پائے گا۔

مُقِیْتٌ۔ قُوْتٌ سے ہے جو انسان کے بقا کا موجب ہے جمع اَقْوَاتٌ ہے ﴿وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا﴾ [حٰمٓ السجدة: 10:41] ''اور اس کی خوراکوں کا اس میں اندازہ کیا'' اور مقیت سے مراد ہے جو ہر چیز کو قوت دیتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے اس لیے اس کے معنی مقتدر یا حافظ ہیں۔ (غ)

جب یہ فرمایا کہ نبی اکیلا ہی جنگ کرنے کا مکلف ہے۔ اگر دین اسلام کی حفاظت معرض خطرہ میں ہو تو بتایا کہ یہ ایک نیک راہ کا قائم کرنا ہے جو لوگ آئندہ اس پر عامل ہوں گے وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے مگر ان کی اس نیکی کے ثواب کے مستحق محمد رسول اللہ ﷺ بھی ہوں گے۔ ایسا ہی منافق جو بری راہیں نکالتے ہیں ان کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جو بعد میں ان بری راہوں پر چلیں گے۔ گو وہ چلنے والے خود بھی اپنا بوجھ اٹھائیں گے۔

707- تَحِیَّةٍ کا مادہ حَیٌّ یا حَیَاۃٌ ہے جس کے معنی زندگی ہیں اور تَحِیَّةٌ اصل میں یہ ہے کہ دوسرے کو حَیَّاكَ اللّٰهُ کہے یعنی زندگی کی دعا دے پھر ہر ایک دعا پر اس کا استعمال ہوا ہے اور ایک دوسرے کو ملنے پر جو دعا دی جاتی ہے وہ بھی تحیۃ ہے اور اسلام کا تحیہ [اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ] ہے۔ (غ) اور اس میں دعا بھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی حواریوں کو اسی سلام سے خطاب کیا تھا [لوقا: 36:24] مسلمانوں نے السلام علیکم کو ترک کر کے جس قدر طریق سلام کے نکالے ہیں وہ سب خلاف قرآن وسنت ہیں۔

السلام علیکم کی سنت:

پچھلی آیت میں جو اچھی راہ بتانے والے کو ہمیشہ کے ثواب کا مستحق ٹھہرایا تو یہاں دعائے ملاقات باہمی کا ذکر کر کے بتا دیا کہ چھوٹے چھوٹے امور میں بھی ایک انسان دوسرے کے لیے اچھی راہ قائم کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ پس فرمایا کہ دعائے ملاقات جو باہم میل جول میں دن رات تم کو دینی پڑتی ہے اس میں بھی بھلائی کی راہ اختیار کرو اور اپنے بھائی کی دعا سے بہتر دعا اسے لوٹاؤ۔ کوئی [اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ] کہے تو جواب میں [وَعَلَیْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ] جیسا کہ

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

سوتمہارے لیے کیا وجہ ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ بنو حالانکہ اللہ نے ان کو اس کی وجہ سے اوندھا کر دیا جو انہوں نے کمایا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت کرو جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے۔ اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو تُو اس کے لیے کوئی راستہ نہ پائے گا۔ (708)

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے اور یوں برابر ہو جاؤ۔ سو ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں۔ (709) لیکن

حدیث میں ہے اور یہ جو حکم ہے کہ چھوٹا بڑے کو پہلے [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہے تو اس میں بھی یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے سے بڑے کی زیادہ دعا کا مستحق ہوگا۔ اور آخر پر فرمایا کہ اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔ تو مراد یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بھلائی کا بھی حساب رکھتا ہے اور اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اور یوں یہ بھی بتا دیا کہ چھوٹی باتوں سے ہی بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں، ان کو حقیر مت سمجھو۔ مسلمانوں میں [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] باہمی محبت کو بڑھانے کا موجب ہے اور حدیث میں افشائے سلام کا حکم ہے خواہ اپنے مسلمان بھائی کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔ مگر یہ سنت بھی مسلمانوں کے اندر سے متروک ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے ترک کرنے میں پرانے اور نئے فیشن کے لوگ یکساں شریک ہیں۔

708- اَرْكَسَهُمْ۔ رَكَسَ کے معنی ہیں کسی چیز کا سر کے بل الٹا کر دینا یا اس کے اول کا آخر کی طرف الٹا دینا۔ پس اَرْكَسَهُمْ کے معنی ہیں ان کو ان کے کفر کی طرف لوٹا دیا۔ (غ)

بخاری، مسلم وغیرھما نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ جو لوگ احد کی جنگ میں رستہ سے واپس آ گئے تھے یعنی وہ تین سو آدمی جن کو عبداللہ بن اُبی رستہ سے واپس لے آیا تھا یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ کسی نے کہا یہ عرینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ مارا تھا۔ کسی نے کچھ خیال ظاہر کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خود مدینہ میں اور مدینہ کے اردگرد منافقین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کے نفاق کے **مختلف مدارج** تھے ان کا ذکر مجملاً یہاں کر دیا ہے۔ پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کرتے بلکہ ان کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ یہاں یہ بتایا کہ مسلمانوں کو ان سے کیا سلوک کرنا چاہیے۔

709- **منافقوں کا پہلا گروہ:** پہلے اس گروہ کا ذکر کیا جو باطن میں کافر ہیں۔ مگر ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ان کے متعلق

فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾

اگر وہ پھر جائیں تو ان کو پکڑو اور ان کو قتل کر دو جہاں کہیں انہیں پاؤ اور ان میں سے نہ کسی کو دوست اور نہ مددگار بناؤ۔ (710)

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا

مگر جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے (711) یا تمہارے پاس آئیں اس حال میں کہ ان کے سینے تنگ ہیں کہ تمہارے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم

صرف یہی حکم دیا کہ ان میں سے کسی کو اپنا ولی نہ بناؤ یعنی ان کے ساتھ قرب ونصرت کا تعلق نہ رکھو۔ ہاں ظاہر میں مسلمانوں والا تعلق ان سے رکھو۔ اللہ کی راہ میں ہجرت سے مراد ایک تو دارالکفر سے نکلنا ہے جہاں فرائض مذہبی ادا نہ کرنے دیئے جاتے ہوں اور دوسرے بموجب حدیث [وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ] (صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ: 10) ''مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔'' تیسرے حفاظت دین کے لیے وطن کا ترک کرنا یا ان حالات کے مطابق جنگ کے لیے نکلنا۔ یہی تیسری قسم کی ہجرت یہاں مراد معلوم ہوتی ہے۔

710- یہاں اسی گروہ کی <u>**دوسری حالت**</u> کا ذکر ہے کہ در پردہ عداوت رکھتا ہوا وہ اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ علانیہ دین اسلام سے پھر کر دشمنوں کے ساتھ جا ملا ہے۔ ان کے لیے وہی حکم ہے جو کفار کے لیے حکم ہے۔ ایسے لوگ مدینہ کے اردگرد تھے جو مسلمانوں کا ذرا غلبہ دیکھ کر اظہار اسلام کرتے اور پھر موقعہ پاتے تو علی الاعلان اسلام سے منحرف ہو کر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے۔ جیسا کہ عرینہ نے کیا جنہوں نے اسلامی چراگاہ پر ڈاکہ مار کر مویشی لوٹ لیے اور محافظوں کو قتل کر دیا۔ پس جو منافق علانیہ دشمنوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرنے میں شامل ہوئے وہ اب دشمن ہوئے اور میدان جنگ میں مقابل نکل آنے کی وجہ سے قتل کی سزا کے مستحق ہوئے۔

711- ان الفاظ میں منافقین کے ایک <u>**تیسرے گروہ**</u> کا ذکر ہے جو اسلام کے بعد پھر علی الاعلان کافر تو ہو گئے ہیں۔ مگر ایسی قوم کے ساتھ جا ملے ہیں جس کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہے جیسے نبی کریم ﷺ نے ہلال بن عویمر اسلمی سے معاہدہ کر لیا تھا کہ نہ وہ آپ کے ساتھ مل کر قریش سے جنگ کریں گے اور نہ قریش سے مل کر آنحضرت ﷺ کے خلاف جنگ کریں گے۔ پس اگر کوئی شخص ایسی قوم سے جا ملے تو گو بوجہ عہد کی خلاف ورزی کے وہ قتل کرنے کے قابل ہو۔ مگر معاہد قوم میں چلے جانے سے اس کے بھی وہی حقوق پیدا ہو گئے جو اس معاہد قوم کے ہیں۔

قَوْمَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

کے ساتھ جنگ کریں۔اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر قابو دے دیتا سو وہ تم سے ضرور لڑتے پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں پھر تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تو اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی۔ (712)

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ع 12 4 9

تم کچھ اور لوگ پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں جب کبھی وہ فتنہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، اس میں اوندھے گر جاتے ہیں۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور (نہ) تم سے صلح کی درخواست کریں اور (نہ) اپنے ہاتھ روکیں تو ان کو پکڑو اور ان کو قتل کر دو جہاں انہیں پاؤ۔اور یہ وہ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلی دلیل دی ہے۔ (713)

712- حَصِرَتْ۔ حَصْرٌ کے معنی تضیق یا تنگی ہیں اور یہاں مراد ہے کہ ان کے سینے بخل اور بزدلی کی وجہ سے تنگ ہو گئے ہیں۔

یہ **چوتھے گروہ** کا ذکر ہے جو دین اسلام سے پھر کر کسی معاہد قوم کی پناہ میں تو نہیں گئے مگر خود نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم کے ساتھ یعنی کفار کے ساتھ۔اور مسلمانوں سے صلح کی درخواست کریں تو ایسے لوگوں سے بھی جنگ جائز نہیں۔

مرتد کب قتل ہو سکتا ہے:

اس سے صاف معلوم ہوا کہ مرتدین کے ساتھ اسی وقت جنگ جائز ہے جب وہ مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ جا ملیں یا خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں۔لیکن اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کریں تو گو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر کفار سے بھی جنگ نہ کریں تاہم ان کو مارنا یا ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔ بنی مدلج کے ساتھ اسی حکم کے ماتحت صلح کی گئی۔ یہ حکم کبھی منسوخ نہیں ہوا۔

713- اس آیت میں ایک **پانچویں گروہ** کا ذکر ہے ان کی غرض صرف اسی قدر ہے کہ کبھی اسلام ظاہر کر دیں تا کہ مسلمانوں کے دشمنوں میں نہ گنے جائیں مگر حالت یہ ہے کہ جب کافر ان کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بلاتے ہیں (فتنہ سے مراد یہاں

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

اور کسی مومن کو شایاں نہیں کہ وہ مومن کو مار ڈالے۔ مگر غلطی سے اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا ادا کرے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ (714) پھر اگر (مقتول) ایسے لوگوں سے ہو جو تمہارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے اور اگر ایسے لوگوں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے تو خون بہا دینا چاہیے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے۔ پھر جو شخص نہ پائے تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے (تاکہ) اللہ اس پر رحمت سے متوجہ ہو اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا ہی ہے دیکھو روح المعانی جہاں اس سے مراد قتال المسلمین لی گئی ہے۔) تو اس میں اوندھے منہ گر جاتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کی کوئی پروا نہیں کرتے مگر بایں ان کو بھی اس قدر موقعہ دیا ہے کہ اگر وہ پھر بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کنارہ کشی کر لیں اور صلح کی درخواست کریں اور عملاً مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے اپنے آپ کو روک دیں تو ان کو کچھ نہ کہا جائے۔ لیکن اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ کریں تو پھر بلاشبہ مسلمان حقدار ہیں کہ جہاں ان کو پائیں قتل کر دیں کیونکہ سوائے اس کے اسلام باقی نہیں رہ سکتا تھا اور مسلمان مار دیئے جاتے۔

714- دِیَۃٌ کا اصل وَدِیَ یَدِیُ سے ہے اور وَدِیٌ کے معنی بہنا ہیں اسی مادہ سے وادی ہے یعنی وہ مقام جس میں پانی بہتا ہے اور دِیَۃٌ میں واؤ کے عوض ھَا لائی گئی ہے۔ (ت) اور دِیَۃٌ خون کا معاوضہ ہے جو مقتول کے وارثوں کو دیا جاتا ہے۔

مسلمان کا مسلمان کو غلطی سے مار دینا:

جب منافقوں کے متعلق احکام کا ذکر کیا تو اب بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر فرماتا ہے اور وہ یہ کہ بعض وقت شبہ میں لوگ قتل ہو جاتے تھے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ یہ محض دھوکہ دینے کے لیے ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص غلطی سے یہ سمجھ کر کہ ایک دشمن اس کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اسے قتل کر دے۔ پس شروع یہاں سے کیا کہ مومن تو

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے اسی میں رہے گا اور اللہ اس پر ناخوش ہے اور اس پر لعنت کرتا ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کرے گا۔ (715)

مومن کو کبھی قتل کر ہی نہیں سکتا ہاں غلطی سے بعض وقت ایسا ہو جاتا ہے کہ مومن کے ہاتھ سے مومن قتل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک قوم دشمن تھی اور مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار مگر ایک شخص ان میں سے مسلمان ہو گیا۔ دوسرے نے اسے مسلمان نہیں سمجھا یا کسی اور کو مارنے کا ارادہ تھا غلطی سے وہ فعل اس پر واقع ہو گیا۔ اور بعض وقت اجتہاد میں خطا سے بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ مومنوں میں جنگ واقع ہو جاتی ہے ایک شخص نیک نیتی سے حق اپنی طرف سمجھتا ہے۔ دوسرا اپنی طرف جیسا کہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے معاملہ میں ہوا یہ بھی قتل خطا کا رنگ ہے۔ مگر اس کا مفصل ذکر سورۃ الحجرات میں آئے گا جہاں دو مومن گروہوں کے باہم قتال کا ذکر آتا ہے۔

715- **مومن کا قتل عمد:** اس آیت کی شان نزول میں روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک مومن کو قتل کر دیا۔ پھر کفر کی طرف لوٹ گیا۔ مگر یہاں لفظ عام ہیں اس لیے یہاں یہ بحث ہوئی ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ الفاظ مذکورہ آیت سے عموماً یہ سمجھا گیا ہے کہ توبہ قبول نہیں ہوتی مگر چونکہ صراحت سے یہ بات ان الفاظ میں نہیں پائی جاتی کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور قرآن کریم نے اصول یہ قائم کیا ہے کہ ہر امر میں توبہ قبول ہوتی ہے ﴿وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ﴾ [طٰہٰ: 82:20] ''اور یقیناً میں اس کو بخشنے والا ہوں۔'' اور قتل نفس کے بارہ میں ہے: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ﴾ [الفرقان: 70:25] ''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا۔'' اور جن کفار نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا آخر خود نبی کریم ﷺ نے ان کو معاف کر دیا اور وہ مسلمان ہوئے اس لیے یہ دعویٰ کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی قرآن وسنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ ہاں ان الفاظ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص گویا کافر کے حکم میں ہے اور جس طرح یہاں قرآن شریف نے مومن کو قتل کرنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے اسی طرح **حدیث نے مومن کو کافر کہنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے۔** جیسا کہ بخاری کی اس حدیث میں ہے [أَيُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِأَخِيهِ يَا كَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا] (صحيح البخاری، كتاب الأدب، باب مَنْ كَفَّرَ أَخَاهُ بِغَيْرِ تَأْوِيلٍ فَهُوَ كَمَا قَالَ: 6104) یعنی ''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو وہ کفر ان دونوں میں سے ایک پر ضرور پڑتا ہے۔''

خُلُوْدٌ کے معنی [نمبر: 39أ] میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس موقعہ پر مفسرین نے بھی اس کے معنی لمبا زمانہ قبول کیے ہیں [وَالْمُرَادُ بِالْخُلُوْدِ الْمُكْثُ الطَّوِيْلُ] ''اور خلود سے مراد ہے کہ طویل زمانہ۔'' (ض)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کرلیا کرو اور جو تمہیں السلام علیکم کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو۔ پس اللہ (تعالیٰ) کے پاس غنیمتیں بہت ہیں تم بھی پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا، سو تحقیق کرلیا کرو[716] اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔[717]

716- **قتل بربنائے کفر نہیں بربنائے جنگ ہے:** یہاں سمجھایا کہ گویا چاروں طرف تمہارے دشمن پھیلے ہوئے ہیں تاہم جب تک یہ امر محقق نہ ہو جائے کہ ایک شخص تمہارا دشمن ہے اسے قتل نہ کرو۔ پچھلے رکوع سے ظاہر ہو چکا ہے اور قرآن شریف کے اور مقامات سے بھی ثابت ہے کہ کافر کو صرف اس حالت میں قتل کرنا جائز ہے جب وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں میں سے ہو۔ اس لیے عام الفاظ میں کہا کہ تحقیق کرلیا کرو کہ کون دشمن ہے اور کون نہیں اور صرف دشمن کو مارو، دوسرے کو نہیں۔

717- سَلٰمَ سے مراد تحیہ اسلامی ہے یعنی [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہنا جو ظاہر نشان اسلام کا ہے اور ایک مسلمان اس کے ذریعہ سے فوراً پہچان سکتا ہے کہ اس کا مخاطب مسلمان ہے یا نہیں۔

مَغَانِمُ۔ مَغْنَمٌ کی جمع ہے۔ مَا يُغْنَمُ اور غَنَمٌ اصل میں بکریوں کو کہتے ہیں اس لفظ سے واحد نہیں آتا اور واحد کے طور پر شَاۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (ت) اور غنم جو اس سے مصدر ہے اس کے معنی ہیں بکریوں کا پالینا اور فتح کر کے ان کا حاصل کرلینا۔ پھر جو کچھ دشمن کی طرف سے فتح کے ذریعہ سے حاصل ہو اس پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ (غ) مگر مطلق [اَلْفَوْزُ بِالشَّيْءِ] کے معنی میں بھی غنم آیا ہے۔ (ح۔ز) جہاں اس کی سند میں اشعار نقل کیے ہیں اور حدیث میں ہے: [اَلصَّوْمُ فِي الشِّتَاءِ الْغَنِيْمَةُ الْبَارِدَةُ.] (سنن الترمذی، کتاب الصوم، باب مَا جَاءَ فِي الصَّوْمِ فِي الشِّتَاءِ، حدیث:802) ''سردیوں کے روزے مال غنیمت ہیں۔'' جہاں غَنِيْمَةٌ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسری حدیث میں غَنِمَ بمعنی زیادت آیا ہے (ن) اور یہاں بھی مغانم وسیع ہے۔

دشمن قوم میں سے السلام علیکم کہنے والے کا حکم:

یہاں اس مشتبہ حالت کا ذکر کیا ہے جب قوم تو دشمن ہو مگر ایک شخص اس میں سے مسلمان ہو چکا ہے تو اس کے مسلمان ہونے کا ثبوت اسی قدر کافی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہے اس صورت میں گو وہ دشمن قوم کا ایک جزو ہو مگر اسے

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

(دونوں) برابر نہیں مومنوں میں سے بیٹھ رہنے والے جن کو کوئی دکھ نہیں اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ نے درجہ میں بزرگی دی ہے اور سب سے اللہ نے اچھا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بڑا اجر دے کر بزرگی بخشی ہے۔ (718)

قتل کرنا نہیں چاہیے۔ بعض ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں اور جب ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کے سامنے یہ عذر کیا کہ جس شخص نے اظہار اسلام کیا تھا وہ محض اپنی جان بچانے کے لیے تھا تو آپ نے فرمایا [هَلَّا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهٖ] (المجعم الکبیر، جلد18، صفحہ226، حدیث:562) ''تو نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھ لیا تھا؟'' ﴿كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ﴾ میں یہ بتایا کہ تم بھی کلمہ شہادت کے اقرار سے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ جو بات تمہارے لیے کافی تھی وہ دوسرے کے لیے بھی کافی ہے۔

دوسری بات جو یہاں فرمائی وہ یہ ہے کہ مال غنیمت کے لالچ سے کسی کو قتل نہ کرو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حصول مقصد کے اور بہتیرے سامان بنا دیئے ہیں۔ **مال غنیمت کے خیال** کو یہاں دنیا کا سامان کہا ہے اور یوں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ جو شخص مال غنیمت کا خیال دل میں لاتا ہے وہ خدا کی راہ میں جنگ نہیں کرتا۔

السلام علیکم اسلام کا نشان ہے:

یہاں قرآن شریف تو فرماتا ہے کہ [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہنے والے کو بھی یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔ مگر آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر سارے حالات بھی ایک شخص کے ایک مسلمان کے دیکھتے ہوں تو پھر بھی کفر کا فتویٰ لگانے سے نہیں ٹلتے۔ اور جو نبی کریم ﷺ نے محض [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہنے والے کے متعلق فرمایا تھا کہ تم نے کوئی اس کا دل پھاڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بالکل خلاف جب ایک شخص عقائد اسلامی کا اظہار کرتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ باتیں یہ منافقانہ کہتا ہے۔ مسلمان کی شناخت قرآن کریم نے تو اتنی موٹی قرار دی ہے کہ وہ [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہتا ہو اور بس۔ اور آج علماء کی یہ حالت ہے کہ ایک شخص کے اقوال کو لے کر بال کی کھال اتارتے ہیں اور تب صبر کرتے ہیں جب کافر بنا لیتے ہیں۔

718- جب یہ خطرات ساتھ لگے ہوئے تھے کہ غلطی سے کوئی مومن ہی قتل نہ ہو جائے تو بعض لوگ خیال کر لیتے کہ پھر ایسے حالات میں

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع 13 5 10

اپنے ہاں مرتبے اور حفاظت اور رحمت اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

جہاد کرنے سے بہتر یہی ہے کہ انسان گھر میں بیٹھ رہے۔ اس لیے فرمایا کہ **جہاد بڑی افضل چیز ہے** اور جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہ جہاد کرنے والوں پر بڑی فضیلت دی ہے۔ یہاں جہاد سے مراد صرف قتال لے کر اہل تشیع نے غلطی کھائی ہے اور کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ غزوات میں شامل ہوئے اس لیے وہ افضل ہوئے حالانکہ جہاد وسیع ہے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب جنگوں میں شامل نہیں ہوئے مگر آپ کا کام اس سے بھی بالاتر تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمات دینی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت بڑھ کر ہیں اور وہ خدمات دینی عظیم الشان جہاد کا حکم رکھتی ہیں۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محض **جہاد کا نہ کرنا خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں**۔ کیونکہ جہاد نہ کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ کا وعدہ دیا ہے۔ جماعت اسلامی میں دونوں قسم کے لوگ رہیں گے۔ ایک وہ بلند مرتبہ لوگ جو جہاد میں لگے رہتے ہیں گو وہ اپنے دنیا کے کام بھی کرتے ہوں۔ مگر ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی وقت اعلائے کلمۃ اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ ان کے مال اور ان کی جانیں دین اسلام کی خدمت کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ ان کا معاش کا سامان بھی خدمت دین کا ہی حصہ ہوتا ہے دوسرے وہ لوگ جو دنیا کے کاموں میں زیادہ منہمک رہتے ہیں۔ ہاں احکام خداوندی کو بھی بجالاتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے ضروری حق ادا کرتے رہتے ہیں۔ دونوں کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ ان کا انجام اچھا ہوگا۔ مگر جہاد کرنے والوں کے بلند مراتب سے ان دوسرے لوگوں کو کچھ نسبت نہیں۔ مگر یہ عامہ حالات کا ذکر ہے۔ خاص صورتوں میں بعض وقت ضروریات قومی ایسی پیدا ہوجاتی ہیں جب ہر ایک متنفس کے لیے جہاد کرنا ضروری ہوجاتا ہے ان حالات میں قدم پیچھے ہٹانے والا عتاب کے نیچے ہوتا ہے۔ جیسا کہ جنگ تبوک میں جو لوگ بلا وجہ پیچھے رہ گئے تھے، ان پر عتاب ہوا۔ کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پروانہ کی اور یوں اس میں شک نہیں کہ اوپر [آیت نمبر: 84] فرمادیا کہ قتال کے لیے مکلف صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں باقی مومنوں کو صرف تحریص دلانا ہے کہ وہ ان بلند مراتب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جو جہاد سے ملتے ہیں اور ناقص حالت پر راضی نہ ہوجائیں۔

﴿غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ﴾ ضَرَرٌ سُوْءٌ حال یا نقصان ہے خواہ انسان کے نفس میں علم یا فضل یا عفت کی کمی سے ہو اور خواہ اس کے بدن میں کسی عضو کے نہ ہونے سے یا کسی اور نقصان بدنی کی وجہ سے ہو اور خواہ حالت ظاہری میں مال اور جاہ کی کمی سے ہو۔ (غ)

أُولِي الضَّرَرِ سے مراد اور ان کا حکم:

یہاں آخری دو قسم کا ضرر مراد ہے یعنی وہ لوگ جو اندھے یا لنگڑے وغیرہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور بدنی نقصان کے سبب سے جہاد میں نکلنے سے معذور ہیں اور وہ لوگ جو سامان نہ رکھنے کی وجہ سے معذور ہیں۔ اور جہاد کو وسیع معنی میں لے کر یعنی اس میں

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

ان کو جن کی فرشتے جان قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں وہ کہیں گے تم کس حال میں تھے؟ کہیں گے ہم ملک میں بے بس تھے (فرشتے) کہیں گے کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ (719)

اعلائے کلمۃ اللہ کو شامل کر کے علم کی کمی والے لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ﴿اُولِي الضَّرَرِ﴾ مجاہدوں کے برابر ہیں اس لیے کہ ﴿اُولِي الضَّرَرِ﴾ کی مختلف حالتیں ہیں۔ ایسے لوگ جو جنگوں میں زخمی ہو کر بے کار ہو گئے ہیں یا خدمت دین میں بیمار ہو گئے ہیں وہ خدا کے نزدیک ایسے ہی ہیں گویا کہ ان اعمال کو پھر بھی بجالا رہے ہیں۔ پھر ایسے لوگ جو دل میں تڑپ رکھتے ہیں۔ مگر سامان ان کے پاس موجود نہیں وہ بھی قاعدین سے بہر حال بڑھ کر ہیں اور عنداللہ اپنی نیت کے مطابق اجر حاصل کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ ایک قوم کا ذکر قرآن شریف میں ہے ﴿تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ﴾ [التوبۃ: 92:9] ''وہ واپس چلے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس غم سے کہ وہ (مال) نہیں پاتے جسے خرچ کریں۔''

719- ﴿ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''نفس پر ظلم کرنے والے۔'' سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو دل سے صداقت اسلام کے قائل ہو گئے مگر باوجود استطاعت کے ہجرت اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ نہ ملے اور کفار کے غلبہ کی وجہ سے اظہار اسلام نہ کر سکے اور ایسے منافق بھی مراد ہیں جو اظہار اسلام بھی کرتے اور پھر کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ بھی کرتے، مگر بظاہر مراد قسم اول کے لوگ ہی ہیں۔

پچھلے رکوع کے آخر پر یہ بتایا تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنا بیٹھ رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے اب ان لوگوں کو سمجھاتا ہے جو کسی کمزوری کی وجہ سے اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ لیتے ہیں۔ مکہ میں بھی بہتیرے ایسے لوگ تھے اور باہر بھی تھے جو دل سے مسلمان تھے مگر اپنے گھر بار کو نہ چھوڑ سکے۔ حالانکہ وہ یہ استطاعت رکھتے تھے کہ ہجرت کر کے دین اسلام کی خدمت بجالائیں اور اس حالت سکون پر راضی ہو گئے۔ ان لوگوں کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے کہا گیا ہے۔ پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہے جو آج دین اسلام کے غلبہ سے مایوس ہو کر سکون پر راضی ہو بیٹھے ہیں اور دین اسلام کے پھیلانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾

مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے کہ نہ وہ حیلہ کر سکتے ہیں اور نہ راستہ پا سکتے ہیں۔[720]

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

سو یہ امید ہے کہ اللہ انہیں معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَ قَعَ

اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں بہتیری جگہ اور کشائش پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتا ہوا اپنے گھر سے نکلے پھر اس کو موت آئے تو اس کا اجر ضرور

720- حِيْلَةً۔ حَوْلٌ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا تغیر اور اس کا دوسرے سے انفصال اسی سے حال ہے جس میں انسان اپنے آپ کو پاتا ہے بلحاظ تغیرات جسمانی یا تغیرات نفس وغیرہ کے اور اسی سے حول بمعنی قوت ہے جیسے [لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ] میں اور اسی سے حال بمعنی حائل ہونے کے ہے۔ ﴿حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ﴾ [السبأ: 54:34] ''ان کے اور ان کی خواہشوں کے درمیان ایک روک ڈال دی جائے۔'' اور حِيْلَةً بھی اسی سے ہے جہاں واؤ یا سے بدل گئی ہے اور اس کے معنی ہیں [مَا يُتَوَصَّلُ بِهٖ إِلٰى حَالَةٍ مَا فِيْ خُفْيَةٍ]، یعنی وہ تدبیر جس سے خفیہ طور پر کسی حالت کو پہنچا جائے۔ (غ) نیز [دیکھو نمبر: 443]۔ اور یہاں حِيْلَةً کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ کفار کے غلبہ اور اذیت کی وجہ سے کھلے طور پر ہجرت نہ کر سکتے تھے۔

پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو استطاعت کے باوجود کفار کے اندر سے نہ نکلے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو فی الواقع نکلنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے نہ ان کو راستہ ملتا تھا۔ یہاں رستہ نہ پانے سے مراد ہجرت کے لیے رستہ پانا ہے اور وِلْدَانٌ سے مراد بچے بھی ہو سکتے ہیں اور غلام لونڈیاں بھی [دیکھو نمبر: 691]۔ لکھا ہے کہ اس آیت کا علم مکہ میں ہوا تو جندب بن ضمرہ رضی اللہ عنہ نے جو بہت بوڑھے ہو گئے تھے اپنے بیٹوں سے کہا کہ مجھے اٹھا کر لے چلو کیونکہ میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کو استطاعت نہ ہو۔ سو وہ اس کو چارپائی پر ڈال کر لے چلے مگر ان کا انتقال رستہ میں ہی ہو گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں احکام الٰہی کی تعمیل کی یہ روح وہ نمونہ ہے جس کی نظیر دنیا کی اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔

اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع 14 4 11

اللہ کے ذمہ ہو چکا۔ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (721)

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖۗ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو کم کرلو۔ اگر تمہیں ڈر ہو کہ جو کافر ہیں وہ تمہیں تکلیف پہنچائیں گے کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ (722)

721- مَرَاغَمَ۔ رِغَامٌ اور رَغِمَ کے معنی مٹی یا باریک مٹی ہیں اسی سے محاورہ [عَلٰی رَغْمِ أَنْفِ] ہے جس سے مراد ذلت قبول کرنا ہے۔ جیسے معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کہ انہوں نے نزول آیت پر اپنی ہمشیرہ کی شادی اسی خاوند سے جس نے طلاق دے دی تھی قبول کی تو کہا [رَغِمَ اَنْفِي لِاَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى] (ت) یعنی خدا کے لیے ذلت کو قبول کرتا ہوں اور مجازاً مُرَاغَمَةٌ سے مراد کسی کو چھوڑنا اور ناراض ہونا ہے۔ اور مُرَاغِمُ بھاگنے کی جگہ اور جانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔ (ت)

مطلب یہ ہے کہ جب واقعی ہجرت کی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ جگہ بھی مہیا کر دیتا ہے جیسے مسلمانوں کو مدینہ میں جگہ مل گئی۔ یا اس سے پیشتر حبش میں جگہ مل گئی۔ پس جب ضرورت ہجرت واقع ہو جائے اور بدوں ہجرت چارۂ کار نہ ہو تو پھر اس خیال سے ہجرت نہ کرنا کہ جگہ نہیں ملے گی صحیح نہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر رستہ میں ہی مر جائے تو اس کا اجر اللہ پر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کی غرض تو خدمت دین تھی۔ ایک شخص مر گیا، خدمت کا موقعہ نہ ملا مگر اللہ تعالیٰ اس کو اس کی نیت کے مطابق اجر دے گا۔

حالات موجودہ میں ہجرت:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہمیشہ ہی سچا ثابت ہوا ہے اور سچا ثابت ہوگا۔ پس یہ ناممکن ہے کہ واقعی تو ضرورت ہجرت ہو اور ہجرت محض اس لیے ترک کی جائے کہ ہجرت کی جگہ کوئی نہیں۔ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ ہجرت کی جگہ ضرور مل جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پچھلے ایام میں جو تحریک ہجرت تھی اس کے لیے فی الواقع ضرورت صحیحہ پیش نہ آئی تھی۔ روئے زمین پر چالیس کروڑ مسلمان ہیں اور کم وبیش سب عیسائی طاقتوں کے اثر کے نیچے ہیں۔ اب چالیس کروڑ کے لیے کوئی ہجرت کی جگہ نہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مشکلات کا حل یہ نہیں کہ وہ سب کے سب عیسائی طاقتوں کی حکومت سے ہجرت کر کے نکل جائیں۔ اگر علم الٰہی میں یہ علاج ان مشکلات کا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے لیے سامان بھی پیدا کر دیتا۔ ان سامانوں کا نہ ہونا یقینی شہادت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات کا علاج نہ ہجرت ہے اور نہ قتال جو بدوں ہجرت ہو نہیں سکتا۔ بلکہ ان کا علاج اپنی اصلاح ہے جس کی طرف مسلمان متوجہ نہیں ہوتے اور اس لیے قدم قدم پر ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔

722- **قصر صلوٰۃ سے مراد:** ﴿تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ قَصْرِ کم کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ تصریح نہیں کی کہ قصر ارکان صلوٰۃ میں ہو یا

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۪ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ

اور جب تو ان کے درمیان ہو پھر ان کے لیے نماز قائم کرے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو اور چاہیے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں، پھر جب سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور چاہیے کہ ایک دوسرا گروہ جنہوں نے نماز نہیں پڑھی آئے پھر وہ تیرے ساتھ نماز پڑھیں، اور وہ اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہیں۔

تعداد رکعات میں۔ مگر سنت صحیحہ سے سفر کی حالت میں قصر رکعات میں ہی ثابت ہے۔ ﴿مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ کہہ کر بتا دیا یہ قصر بعض نمازوں میں ہے سب میں نہیں۔ چنانچہ ظہر، عصر، عشاء میں ہی چار رکعت کی جگہ دو رکعت سفر میں پڑھی جاتی ہیں۔ قصر صلوٰۃ کی ضرورت اس صورت میں فرمائی ہے، جب حالت سفر ہو۔ [ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ] کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 88]۔ سفر کی حالت کیا ہے اس کے لیے [دیکھو نمبر: 225]۔ یہاں گو قصر صلوٰۃ ایک رخصت کے رنگ میں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جب خود اس کو ایک ضرورت کے مقام پر رکھ کر رخصت دی ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا بھی درست نہیں اور نبی کریم ﷺ سے سفر میں قصر صلوٰۃ پر ہمیشگی اختیار کرنا ثابت ہے۔ اور یہ حدیث کہ آپ قصر بھی کرتے تھے اور پورا بھی کرتے تھے صحیح نہیں جیسا کہ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ پس سفر میں نماز کو قصر کرنا چاہیے یعنی صرف فرض ادا کرے اور وہ بھی جن نمازوں میں چار ہیں ان میں صرف دو ادا کرے جب فرض کم ہو گئے تو نوافل خود ساقط ہو گئے۔ فجر کی دو سنتیں جو مؤکدہ ہیں اور نبی کریم ﷺ نے کبھی ترک نہیں کیں اور وتر ادا کر لے۔ اور اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہے کہ جب جہاد اور ہجرت کی تحریص دلائی اور اس پر زور دیا تو یہ صورتیں سفر کو چاہتی ہیں۔ پس نماز سفر کا حکم اور اس کے ساتھ ہی نماز جنگ کا حکم بیان فرما دیا۔

مگر علاوہ سفر کے یہاں قصر کے لیے بظاہر ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ کافروں کے تکلیف پہنچانے کا خوف ہو۔ تو کیا قصر نماز صرف خوف کی حالت میں ہے اور امن کی حالت میں نہیں؟ جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ہر قسم کے سفر میں قصر ثابت ہے اور اسی پر امت کا تعامل ہے۔ یعلی بن امیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ باوجود حالت امن میں ہونے کے آپ قصر کیوں کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ جس بات پر تمہیں تعجب ہوا ہے اس پر مجھے بھی تعجب ہوا اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا [صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ ، فَاقْبَلُوا صَدَقَتَهُ] (صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب صَلاَةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا: 1605) یعنی ''قصر صلوٰۃ ایک صدقہ ہے جو اللہ نے تم پر کیا۔ پس اس کے صدقہ کو قبول کرو۔'' جس سے معلوم ہوا کہ یہ قصر صلوٰۃ یعنی چار کی بجائے دو رکعت فرض خوف سے مشروط نہیں۔ پس اس حدیث اور سنت صحیحہ ثابتہ سے معلوم ہوا کہ قصر صلوٰۃ دو طرح پر ہے۔ ایک چار رکعت

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲

کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے اسباب سے غافل ہوتو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہوتو اپنے ہتھیار اتار رکھو اور اپنا بچاؤ لیے رہو۔ یقیناً اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔(723)

کی بجائے دو رکعت ظہر، عصر، عشاء میں۔اور یہ صرف حالت سفر سے مشروط ہے اور دوسرا وہ قصر جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے جو **حالتِ خوف** سے مشروط ہے۔یعنی دو رکعت کی بجائے ایک رکعت باجماعت ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلا جانا اور قرآن کریم کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ کفار کے تکلیف پہنچانے کے خوف کا یوں کوئی ازالہ نہیں ہوسکتا کہ چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھ لی جائیں۔صرف اتنے وقت کی کمی خوف کا علاج نہیں۔دشمن اتنی دیر میں کہ دو رکعت ادا کی جائیں حملہ کر کے کام تمام کر دے گا۔ بلکہ خوف کا علاج وہی ہے جو خود اگلی آیت میں بیان فرمایا کہ ایک گروہ دشمن کے مقابل پر رہے اور جب دوسرا گروہ ایک رکعت ادا کر کے دشمن کے مقابل پر چلا جائے تو پہلا گروہ امام کے ساتھ دوسری رکعت باجماعت ادا کر لے۔تا دشمن نماز پڑھنے والوں پر حملہ ہی نہ کر سکے۔اور یہ ظاہر ہے کہ بجائے چار کے امام نے بھی صرف دو رکعت ادا کی ہیں اور مقتدیوں نے امام کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت ادا کی ہے۔پس چار رکعت کی بجائے دو رکعت کا ہونا شرط اول کے ماتحت ہے یعنی سفر کی وجہ سے اور دو رکعت کی بجائے صرف ایک ایک رکعت باجماعت ادا کرنا شرط دوم کی وجہ سے ہے یعنی دشمن کے خوف سے اور دشمن کے خوف کا یہی دوسرا قصر علاج ہے نہ پہلا قصر۔اگر محض چار رکعت کی جگہ دو رکعت دشمن کے خوف کا علاج ہوتا تو یہ دوسرا علاج نہ بتایا جاتا۔پس اس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کریم کا منشا یہی تھا جو رسول اللہ ﷺ نے سمجھا اور عمل کر دکھایا یعنی سفر کی وجہ سے چار رکعت کی جگہ دو رکعت ادا کرو۔اور خوف کی وجہ سے دو رکعت کی جگہ باجماعت صرف ایک رکعت ادا کر لو۔اس سے اگر ایک طرف قرآن کا پر حکمت کلام ہونا معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف نبی کریم ﷺ کا وحی خفی سے اس کے باریک سے باریک مطالب پر آگاہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔﴿مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ کے بعد وقف اسی معنی کا مؤید ہے۔

723- **عین حالت جنگ اور میدان جنگ میں ہونے کی صورتیں الگ الگ ہیں:** حالت جنگ میں جب دشمن کا خوف ہو ایک صورت ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ [البقرة: 239:2] ''پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیدل یا سوار (جس طرح ہو نماز پڑھ لو)۔''

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرو اور جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو (اصلی حالت پر) قائم کرو۔ نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے۔ (724)

جیسا کہ [نمبر: 308] میں دکھایا گیا وہ ایسے خوف کی حالت ہے جب جماعت کا قیام نہیں ہوسکتا اور دوسری صورت یہاں بیان فرمائی ہے۔ اسی لیے یہاں فرمایا ﴿فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ﴾ یعنی ایسی حالت ہو کہ نماز باجماعت ہوسکتی ہے۔ ہاں دشمن کی طرف سے حملہ کا خوف ہے اور ظاہر ہے کہ میدان جنگ میں دشمن ایسے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دے گا جب مسلمان مشغول نماز ہوں۔ پس یہ وہ صورت ہے جب میدان جنگ میں ہونے کی وجہ سے دشمن کے حملہ کا خوف ہے مگر فی الواقع حالت جنگ نہیں۔ کیونکہ اس میں اس قدر اہتمام بھی مشکل ہے اور اسی لیے یہاں بارش وغیرہ کی صورت میں ہتھیاروں کے رکھ دینے کی بھی اجازت ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع میں میدان جنگ میں نماز:

روایات میں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ اس نماز کی کیفیت کیا تھی۔ مگر ترجیح اس روایت کو ہے جسے بخاری اور مسلم اور اصحاب سنن ثلاثہ اور امام احمد نے بیان کیا ہے اور جس کے مطابق سیدنا علی، سیدنا ابن عباس، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہم و دیگر صحابہ کا مذہب ہے یعنی یہ کہ غزوہ ذات الرقاع میں آنحضرت ﷺ نے یوں نماز ادا کی کہ ایک گروہ نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل پر رہا۔ جب نبی کریم ﷺ ایک رکعت ادا کر چکے تو آپ حالت قیام میں ہی رہے یہاں تک کہ جو گروہ آپ کے پیچھے تھا وہ دوسری رکعت ادا کر کے پیچھے ہٹ گیا اور دشمن کے مقابل پر ہو گیا اور دوسرا گروہ جو پہلے دشمن کے مقابل پر رہا تھا نبی کریم ﷺ کے پیچھے کھڑا ہوا اور آپ نے دوسری رکعت اس کے ساتھ ادا کی اور جب آپ نے سلام پھیرا تو اس گروہ نے اٹھ کر بقیہ رکعت پوری کر لی۔ بعض روایات میں صرف ایک ہی رکعت کا ذکر ہے۔ یعنی مقتدیوں نے صرف ایک ہی رکعت باجماعت ادا کر کے نماز ختم کر لی۔

724- یہاں اس حالت کی نماز کو قضائے صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے اور حالت امن کی نماز کو اقامت صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اقامت میں سب شرائط کا پورا کرنا آتا ہے جو حالت خوف میں نہیں ہوسکتیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ نماز سفر بحالت خوف میں اور نماز سفر بحالت امن میں فرق صرف یہ ہے کہ حالت خوف میں سب شرائط پوری نہیں ہوسکتیں اور یہ گویا دوسری قسم کا قصر ہے۔ نہ قصر تعداد رکعات۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے عام لفظ قصر صلوٰۃ ہی اختیار کیا ہے اور تعداد رکعات میں قصر کا ذکر نہیں کیا۔ گویا دو رکعت کی بجائے ایک رکعت جماعت کے ساتھ ادا کرنا بھی ایک رنگ قصر ہے اور اگر ایک ہی رکعت کا ادا کرنا لیا جائے، تو یہ

وَ لَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع 15 4 12

اور (دشمن) قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو۔ اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو جس طرح تم دکھ اٹھاتے ہو وہ بھی دکھ اٹھاتے ہیں۔ اور تم اللہ سے وہ امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (725)

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾

یقیناً ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے اور دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا۔ (726)

قصر ظاہر ہے۔

725- اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہے کہ وہاں دشمن سے اپنا بچاؤ کرنے کا ذکر ہے حتی کہ نماز کے وقت بھی اپنا بچاؤ کر لینا چاہیے اور یہاں یہ ذکر ہے کہ دشمن کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر دشمن کا پیچھا کرنے میں ہوشیاری دکھائی جائے تو یہ خود اپنے بچاؤ کا سامان ہے اور یہ جو فرمایا کہ تم وہ امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے تو یہ ان صریح پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اسلام کے آخری غلبہ کی خبر دی گئی تھی۔ اور جو مسلمانوں کے لیے قوت کا موجب تھیں۔

726- ﴿اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ کے معنی یہاں عَلَّمَكَ اللّٰهُ ہیں جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے۔ (غ) اور رُؤْيَةٌ بھی جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی علم ہوتے ہیں۔ (غ)

خَائِنٌ۔ خیانت کرنے والا۔ اور خِيَانَةٌ اور نِفَاقٌ اصل میں ایک ہیں۔ خیانت باعتبار عہد و امانت کہا جاتا ہے اور نفاق باعتبار دین۔ اور خِيَانَةٌ سے مراد ہے حق کی مخالفت جو خفیہ طور پر نقض عہد سے کی جائے۔ (غ) اور خَوَّانٌ جو آگے آتا ہے اس سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔

خَصِيْمٌ۔ خَصَمَ جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں اور خَصِيْمٌ وہ ہے جو کثرت سے مخاصمت کرے۔ (غ)

طعمہ بن ابیرق کا واقعہ:

منافق جو اسلام کا اظہار کرتے تھے تو وہ سمجھتے تھے کہ ضرورت کے وقت مسلمان کہلانے کی وجہ سے ہماری رعایت ہوگی۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں تو سخت ترین دشمن کے ساتھ اور بڑے سے بڑے دوست کے خلاف بھی عدل کا حکم تھا۔ اس لیے

وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۱۰۶﴾

اور اللہ کی حفاظت مانگ بے شک اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(727)

اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کے بارے میں یہ خاص حکم اپنے نبی پر اتارا تا کہ ان کی یہ جھوٹی امیدیں منقطع ہو جائیں۔ ایک خاص واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایک انصاری طعمہ بن ابیرق تھا اس نے ایک دوسرے شخص کے گھر سے ایک زرہ چرائی اور پھر اس کو ایک یہودی کے پاس رکھ دیا۔ جب تحقیقات شروع ہوئیں اور زرہ کا اثر طعمہ کے گھر تک پہنچا اور آخر وہ یہودی کے گھر سے برآمد ہوئی تو اس نے طعمہ کا پتہ بتایا۔ مگر اس نے انکار کیا اور اس کے ساتھیوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس کی بریت کی مگر آپ نے فیصلہ اس کے خلاف دیا اور اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کی فوق العادت امانت اور دیانت:

ان الفاظ سے کہ دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا۔ یہ قیاس کر لینا کہ آپ نے کوئی طرفداری کی ہوگی ایک نادانی کا خیال ہے۔ کسی حکم کا جو آپ کو قرآن میں دیا گیا ہے ہرگز یہ منشا نہیں کہ آپ نے اس کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس لیے اس حکم کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ امت کو تعلیم دینا مقصود ہے ورنہ آپ خود اعلیٰ سے اعلیٰ اصول پر قائم تھے۔ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ﴾ کا حکم بار بار کیوں دیا جاتا تھا۔ کیا اس لیے کہ آپ نے نماز ترک کر دی تھی؟ آپ نے جیسا کہ اوپر کی روایت سے ظاہر ہے۔ خائن کی طرف سے جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا۔ پس ان الفاظ کے لانے کا منشا منافقین کی جھوٹی امیدوں کا منقطع کرنا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی صداقت اور دیانت قبل از نبوت بھی عرب میں مسلم تھی۔ اگر آپ میں اس قسم کی طرف داری کا مادہ ہوتا تو عرب ایسی اکھڑ قوم آپ کو الامین کا خطاب کیونکر دیتی۔ پس اگر قبل از نبوت بھی آپ کی امانت و دیانت پر کوئی شخص حرف نہ رکھ سکتا تھا تو بعد از نبوت ان باتوں کا قیاس آپ کے خلاف کرنا صریح واقعات کا انکار کرنا ہے ہاں بلاشبہ آپ کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کے اندر بڑے بڑے لوگوں کا قدم ڈگمگا جاتا۔ مگر آپ کی فوق العادت دیانت اور امانت میں ایسے ایسے موقعوں پر کبھی بال برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ایسے ہی مواقع پر وحی الٰہی نے بھی آپ کی دستگیری فرمائی ہے۔ چنانچہ خود طعمہ والے واقعہ سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یہودیوں کے تعلقات آپ کے ساتھ کھلی دشمنی کے ہو چکے ہیں اور ادھر اسلام کو اس قدر مصائب اور مشکلات کا سامنا ہے کہ ایک ایک متنفس جو اس کی حمایت کے لیے کھڑا ہو سکتا ہو اس کا وجود از بس غنیمت ہے۔ ادھر بہت سے گواہ شہادت دینے والے موجود ہیں جو طعمہ کو بری ٹھہرا رہے ہیں۔ مگر نبی کریم ﷺ کو نہ یہ پروا ہے کہ یہودی ہمارے دشمن ہیں نہ یہ کہ طعمہ کو ملزم قرار دینے سے اس وقت بہت سے مسلمان اور بھی اس کے ساتھ ہاتھ سے جاتے ہیں۔ آپ عین حق و انصاف کے مطابق یہودی کے حق میں اور مسلمان کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔ ایسے عدل و انصاف کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کوئی اور ملتی ہے تو پیش کی جائے۔

727- جب ایک طرف اس اصول پر آپ کو قائم کیا کہ کسی خائن دغاباز کی حمایت آپ نہ کریں گے تو مشکلات کا تو اور بھی اضافہ ہو گیا۔

وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۚ﴿۱۰۷﴾

اوران کی طرف سے مت جھگڑ جو اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہیں۔ اللہ بڑے خیانت کرنے والے گنہگار کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

یہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے اور وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو مشورے کرتے ہیں جس بات کو وہ پسند نہیں کرتا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

دیکھو تم وہ لوگ ہو جو دنیا کی زندگی میں ان کی طرف سے جھگڑتے ہو۔ پر قیامت کے دن کون ان کی طرف سے اللہ کے ساتھ جھگڑے گا؟ یا کون ان کا وکیل بنے گا؟[728]

وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ

اور جو شخص بدی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے

اس لیے فرمایا کہ مشکلات میں اللہ کی حفاظت چاہو۔ استغفار کے ان معنوں کے لیے [دیکھو نمبر: 258 ،388]۔ خدا کی حفاظت کا کون انسان محتاج نہیں بلکہ جس نے ایک آن کے لیے بھی اپنے آپ کو خدا کی مدد سے مستغنی سمجھا وہ ہلاک ہو گیا۔ یا مراد یہ ہے کہ جو غلطی کرتے ہیں ان کے لیے استغفار کرو۔ اور سیاق اس کو بھی چاہتا ہے۔

728- یہ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو اپنی کم فہمی سے منافقوں کے دھوکہ میں آ کر ان کے حامی بن جاتے ہیں۔ جیسا طعمہ والے واقعہ میں۔ طعمہ کے رشتہ داروں نے اس کی حمایت کی تو ایسے لوگوں کو سمجھایا ہے کہ یہ منافق در پردہ دشمن اسلام ہیں اور حق اور راستی سے دور پڑے ہوئے ہیں تم ان کے حامی نہ بنو بلکہ حق کے حامی بنو۔ [آیت نمبر: 107] میں وَ لَا تُجَادِلْ میں خطاب عام ہے جیسا کہ [آیت نمبر: 109] کے الفاظ ﴿هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ﴾ ''دیکھو تم وہ لوگ ہو جو ان کی طرف سے جھگڑتے ہو۔'' جمع لا کر صاف کر دیا۔

يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

بخشش چاہے وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا۔

وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾

جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنی جان پر ہی اس کا وبال لیتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع 16 8 13

اور جو شخص خود قصور یا گناہ کرے پھر ایک بے گناہ پر اس کی تہمت لگائے یقیناً وہ اپنے اوپر بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ لیتا ہے۔ (729)

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ الثلثة

اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ قصد کر ہی چکا تھا کہ تجھے گمراہ کریں اور وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں اور تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور تجھے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا۔ اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔ (730)

729- خَطِيْٓـَٔةً اور اِثْمٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 105] اور [نمبر: 108] بلحاظ ان کے اصل معنی فرق یہ ہیں کہ خَطِيْٓـَٔةً وہ ہے جو بلا عمد سرزد ہو اور اثم وہ ہے جو عمد سے ہو اور یہی فرق ابن جریر نے کیا ہے یا خَطِيْٓـَٔةً وہ ہے جس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود ہو اور اثم وہ جس کا اثر بد دوسرے پر پڑے۔

اس قسم کی کمینہ حرکت کو کہ انسان خود برا کام کرے اور دوسرے کے ذمہ لگا دے قرآن کریم نے منافقوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک یہودی کے متعلق بھی یہ جائز نہ تھا کہ خود برے فعل کا ارتکاب کر کے اس کے سر پر وہ تھوپا جاتا۔ یہ تو وہ اخلاق تھے جو قرآن کریم نے دشمنوں تک کے متعلق سکھائے تھے۔ مگر آج کتنے مسلمان ہیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں اور آج غیر مسلموں کا مال لے لینا تو ایک طرف رہا مسلمان بھائیوں پر کفر کے فتوے لگا کر ان کے مال بھی بالباطل لے لینا جائز قرار دیا جاتا ہے اس سے بڑھ کر کیا خیانت ہوگی؟

730- يُّضِلُّوْكَ۔ اِضْلَالٌ کے ایک معنی اِهْلَاكٌ بھی آتے ہیں یعنی ہلاک کرنا۔ اَضَلَّهٗ۔ [ضَيَّعَهٗ وَ اَهْلَكَهٗ] (ت) یہی معنی یہاں

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

ان کے بہت سے خفیہ مشوروں میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اس کے کہ کوئی خیرات یا بھلے کام یا لوگوں میں اصلاح کے لیے حکم دے اور جو شخص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بہت بڑا اجر دیں گے۔ (731)

مراد ہیں جس طرح ﴿اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ﴾ [القمر: 47:54] ''بے شک مجرم گمراہی اور دکھ میں ہیں۔'' میں ضلال کے معنی ہلاکت ہیں۔ (ت) کیونکہ جب ان کے قصد اضلال کا ذکر کیا تو جواب میں تسلی کے طور پر فرمایا کہ تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اس سے پہلے اور پیچھے بھی منافقوں کے خفیہ مشوروں اور ان کے منصوبوں کا ہی ذکر ہے۔ پس سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے یہی معنی درست ہیں۔ اور اگر گمراہ کرنا معنی لیے جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔

یہاں یہ بتایا کہ منافق صرف اتنی کمزوری ہی نہیں دکھاتے کہ جنگ سے پیچھے ہٹتے ہوں بلکہ وہ اسلام کے چھپے ہوئے دشمن ہیں اور ہمیشہ اسلام کو تباہ کرنے کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی تسلی دی کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کتاب و حکمت دے کر بھیجا گیا ہے۔ جس کی اس نے دنیا میں تعلیم دینی ہے۔ پس وہ ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری جگہ فرمایا ﴿هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا﴾ [التوبة: 74:9] جو کچھ قصد یہ منافق کرتے ہیں اس مقصد کو کبھی نہیں پائیں گے۔

731- نَجْوٰی۔ اس کا اصل بھی وہی ہے جو نَجَاۃٌ کا اصل ہے اور نَاجَيْتُهُ کے معنی ہیں اس سے خفیہ طور پر مشورہ کیا اور اس کی اصل نَجْوَۃٌ سے ہے جس کے معنی بلند زمین ہیں گویا وہاں اس کے ساتھ تنہا ہو، اسی سے نَجْوٰی مصدر ہے یعنی خفیہ مشورہ کرنا۔

یہاں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان کے خفیہ مشوروں میں بھلائی کی کوئی بات تو ہوتی نہیں۔ کیونکہ وہ جب چھپ کر مشورہ کرتے ہیں تو نقصان پہنچانے کے لیے ہی کرتے ہیں۔ اسی لیے یہاں کثیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور پھر فرمایا کہ بھلائی کا کام تو یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کو صدقات دینے کے لیے کہے یا نیک بات کی ہدایت کرے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا کوئی کام کرے۔ مگر یہ جب ملتے ہیں تو ان امور کے خلاف ہی کچھ کرتے ہیں۔ **اصلاح بین الناس** کی حدیث میں بڑی تعریف آئی ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں جس کو ابوداؤد، ترمذی و احمد نے بیان کیا ہے یہ لفظ آتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو فرمایا کہ میں تم کو ایسے عمل کی خبر دوں جس کا درجہ نماز اور روزے سے بڑھ کر ہے۔ صحابہ نے عرض کیا ہاں۔ تو فرمایا کہ لوگوں میں اصلاح کرنا۔ صرف مسلمانوں میں نہیں کہا بلکہ سب لوگوں میں۔ آج کل مسلمانوں کو اس نصیحت پر عمل کی بہت ضرورت ہے۔ کیونکہ ترقی کی جڑ اتفاق اور اتحاد ہے آج ان میں تفرقہ ڈلوانے والے بہت ہیں مگر اصلاح کرنے والوں کا وجود کالعدم ہے۔

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع 17 3 14

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لیے حق کھل چکا اور مومنوں کے رستے کے سوائے اور راستہ کی پیروی کرے ہم اسے پھیر دیں گے جدھر وہ پھرتا ہے۔ اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔ (732)

اس آیت میں بھلائی کی ان سب قسموں کو جو ایک انسان دوسرے کے ساتھ کر سکتا ہے جمع کر دیا ہے۔ اول صدقہ رکھا یعنی جو مالی امداد کا محتاج ہو، اس کو مالی مدد دینا۔ دوسری قسم کی بھلائی یہ ہے کہ انسان کسی کو اچھی راہ پر ڈال دے یعنی اسے معروف کا حکم دے اور تیسری یہ کہ فساد کو دور کر کے اصلاح کر دے یہ وہ کام تھا جو محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی کر رہے تھے۔

732- ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ تَوَلِّيَةٌ۔ دوسرے کے ساتھ قرب کا تعلق پیدا کرنا ہے۔ پس ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ کے معنی ہوئے ہم اس کا تعلق اسی کے ساتھ ہونے دیں گے جس کے ساتھ وہ خود تعلق پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انسان سے معاملہ اس کے عمل کے مطابق ہوتا ہے:

انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یوں ہی نظر آتا ہے کہ انسان جس سے تعلق پیدا کرنا چاہے اس سے اس کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ نیکوں کے ساتھ تعلق اور محبت پیدا کرے ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ بدوں کے ساتھ کرے تو ان سے۔ پس جب ایک گروہ نے باوجود ہدایت کے کھل جانے کے دن رات مسلمانوں میں رہنے کے، رسول اللہ ﷺ کی دشمنی کے طریق کو اختیار کر لیا تو خدا ان کو مجبور کر کے دوسری راہ پر نہیں ڈالتا بلکہ اس کے قانون قدرت کے مطابق ان کو پھر وہی راہ اچھی لگتی ہے، جس کا انجام جہنم ہے یا یہ محاورہ [وَلَّيْتُ وَجْهِيْ كَذَا] سے ہے جس کے معنی ہیں میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ گویا جدھر انسان توجہ پھیرتا ہے اسی طرف اللہ بھی اس کی توجہ کو پھیر دیتا ہے۔

اجماع اُمت:

امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے تین سو مرتبہ قرآن شریف اس غرض کے لیے پڑھا کہ اجماع امت کے دلیل شرعی ہونے پر کون سی آیت حجت ہے۔ اور آخر ان کو یہ آیت ملی۔ اس پر یہ اعتراض ہوا ہے کہ ﴿سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کوئی الگ راستہ نہیں بلکہ [قَالَ اللّٰهُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ] پر ایمان ہی ﴿سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ہے، اور وہ وہی ہدایت ہے جس کا ذکر یہاں موجود ہے۔ پس ان الفاظ سے اجماع امت پر کوئی دلیل پیدا نہیں ہوتی اور اگر سیاق و سباق عبارت پر غور کیا جائے تو یہ اعتراض بالکل صحیح ہے۔ یہاں ذکر رسول اللہ ﷺ سے دشمنی کا ہے کہ کوئی شخص ایمان اور محبت کی بجائے کفر اور دشمنی کے طریق کو اختیار کرے اور ان میں سے اول الذکر مومنین کا رستہ ہے۔ اس سے بڑھ کر مومنین کے رستہ سے کچھ مراد نہیں اور نہ ہی

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس کے سوا ہو جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔ (733)

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾

اسے چھوڑ کر وہ سوائے بے جان چیزوں کے اور کسی کو نہیں پکارتے، اور وہ سرکش شیطان کے سوا اور کسی کو نہیں پکارتے۔ (734)

اجماع کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ تمام مسلمانوں کا کس طرح ایک بات پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ بات قرآن یا حدیث میں ہو۔

733- پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا کہ صحیح رستہ وہی ہے جس پر مومن ہیں۔ اب اس رکوع میں ایک مشرک اور ایک موحد کا مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ منافقین نے کون سا طریق اختیار کیا ہے اور کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہے اس لیے اس کا ذکر کیا۔ شرک کے نہ بخشنے پر [دیکھو نمبر: 668]۔ اور یہاں بتا بھی دیا کہ مشرک کو اللہ تعالیٰ کیوں نہیں بخشتا۔ اس لیے کہ وہ گمراہی میں اس قدر دور نکل جاتا ہے کہ وہاں سے واپس آنا مشکل ہوتا ہے۔ شرک اور بت پرستی کے برابر کسی بیماری کی جڑیں گہری نہیں۔

734- اِنَاثٌ۔ اُنْثٰی کی جمع ہے اور جن سے وہ سوائے خدا کے اپنی حاجت برآری چاہتے ہیں ان کو اناث کہا ہے یا اس لحاظ سے کہ ان کے ہاں اکثر بتوں کے نام مؤنث تھے جیسے لات اور عزی اور منات۔ (غ) اور حسن سے روایت ہے کہ ہر ایک قبیلہ کا ایک بت ہوتا تھا جسے وہ انثیٰ بنی فلاں کہتے تھے۔ یعنی فلاں قبیلہ کی دیوی۔ اور یا اس لحاظ سے کہ ان چیزوں کو جن میں روح نہ ہو اِنَاثٌ کہا جاتا تھا۔ اور یہ بھی حسن سے روایت ہے۔ (ج) امام راغب رحمہ اللہ نے بھی اناث سے مراد جمادات ہی لیے ہیں کیونکہ ان میں صرف قوت منفعلہ ہے یعنی دوسرے کا اثر قبول کرنا اور وہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ ان کے معبودوں کے لیے اختیار کر کے ان کو ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کہ وہ اشیاء جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی اور نہ کوئی کام کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ان کو وہ اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ اسی کی مثل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: ﴿يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا﴾ [مریم: 42:19] ''اے میرے بزرگ تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ کچھ تیرے کام آ سکتا ہے۔'' اور دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا﴾ [الزخرف: 19:43] ''اور انہوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں دیویاں بنایا۔'' تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ (غ)

مَرِيْدٌ۔ مَرَدَ سے ہے۔ شَجَرٌ اَمْرَدُ اس درخت کو کہا جاتا ہے جس پر پتے نہ ہوں اور اَمْرَدُ مردوں میں سے وہ ہے جس کے منہ پر

وقف لازم

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾

اسے اللہ نے پھٹکار دیا ہے اور اس نے کہا میں ضرور تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لوں گا۔

وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ ؕ

اور میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور انہیں جھوٹی آرزوئیں دلاؤں گا اور انہیں کہوں گا سو وہ جانوروں کے کان چیریں گے (735) اور انہیں کہوں گا سو وہ اللہ کے بنائے ہوئے (دین) کو بدل دیں گے۔ (736) اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بناتا ہے وہ یقیناً کھلا نقصان اٹھاتا ہے۔

ابھی بال نہ نکلے ہوں۔ اس لیے مَرِیْدٌ اور مَارِدٌ ﴿وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ﴾ [الصافات: 7:37] ''اور ہر سرکش شیطان سے (ان کی) حفاظت کی ہے۔'' جنوں اور انسانوں میں سے وہ ہے جو ہر قسم کی بھلائی سے خالی ہو اور ایک روایت میں ہے [اَهْلُ الْجَنَّةِ مَرَدٌ] تو یہ ظاہر پر بھی حمل ہو سکتا ہے اور یہ بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں کہ وہ ہر قسم کے نقصوں اور قباحتوں سے خالی ہوں گے اور ﴿مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾ [التوبة: 101:9] سے مراد ہے کہ وہ ہر قسم کے محاسن سے خالی نفاق پر ہیں۔

شیطان کی عبادت سے مراد:

ان الفاظ کے بڑھانے سے کہ وہ سرکش شیطان کے سوائے اور کسی کو نہیں پکارتے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو وہ خدا کر کے پکارتے ہیں انہوں نے تو کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ صرف شیطان کے بہکانے سے ان کو اپنا معبود سمجھتے ہیں۔ پس گویا اس کی اطاعت کر کے اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

735- لَيُبَتِّكُنَّ۔ يُبَتِّكُ کا مادہ بَتَّكَ ہے اور بَتَّكَ اور بَتَّ کے معنی ایک ہیں۔ یعنی قطع کرنا اس فرق سے کہ اعضاء اور بالوں کے کاٹنے میں بَتَّكَ کہا جاتا ہے اور ذرائع اور ملاپ کے کاٹنے پر بَتَّ۔ (غ)

کان چیرنے کی رسم:

ایام جاہلیت میں رسم تھی کہ جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی اور پانچواں نر ہوتا تو اس کے کان چیر کر اس کو چھوڑ دیتے اور نہ اس پر سوار ہوتے نہ اس سے کوئی کام لیتے۔ یہ ایک مشرکانہ رسم تھی یعنی بتوں کے نام پر ایسا کرتے تھے۔ اس کو بحیرہ کہتے جس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ﴾ [المآئدة: 103:5] ''اللہ نے نہ کوئی بحیرہ بنایا ہے اور نہ سائبہ۔'' (ج) اور بعض نے کہا ہے کہ بتوں کی پرستش کا یہ ایک حصہ تھا کہ جانوروں کے کان چیر دیتے تھے۔

736- خلق اللہ سے یہاں کیا مراد ہے؟ خود قرآن کریم نے اس کی تصریح دوسری جگہ فرما دی ہے ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ

يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾

وہ اُن کو وعدے دیتا ہے اور ان کو جھوٹی آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان صرف ان کو دھوکا دینے کو ہی وعدے دیتا ہے۔ (737)

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ز وَ لَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

یہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ اس سے کوئی بھاگنے کی جگہ نہ پائیں گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کو ہم باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ انہی میں رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ﴾[الروم: 30:30] ''اللہ کی دی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ مضبوط دین ہے۔'' پس خلق اللہ کی تبدیلی سے مراد دین الٰہی کی تبدیلی ہے اور یہی معنی حسن، ضحاک، مجاہد اور بہت سے ائمہ سے مروی ہے۔ (ث۔ج) اور صحیحین کی حدیث میں ہے: [كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ] (صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ: 1385) یعنی ''ہر ایک بچہ اسی فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے۔'' گویا ایک طرف اگر بڑی موٹی قسم شرک کی بتادی یعنی جانوروں کے کانوں کا چیرنا تو دوسری طرف اس کی باریک سے باریک صورت کو بیان کر دیا۔ یعنی الٰہی دین کو بدلنا جس سے مراد اللہ کے حلال کو حرام اور اس کے حرام کو حلال کرنا ہے۔ اس کی تفسیر [لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب (وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ): 4886) سے کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس سے خلق اللہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ورنہ ہر ایک زینت خلق اللہ کی تبدیلی ہو جائے گی اور حدیث کا منشا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں پر آپ نے لعنت کی ہے جو دیکھنے والوں کو زنا کی طرف بلانے کی غرض سے ہاتھوں وغیرہ پر نیل بھر لیتی ہیں اور تغیر خلق اللہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد اس سے اس غرض کی تبدیلی ہے جس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ مثلاً حیوانوں کو سواری کے لیے پیدا کیا۔ بحیرہ سائبہ بنا کر ان کی پرستش کرنا تغییر خلق اللہ ہے۔ سورج چاند کو انسان کے لیے مسخر کیا ان کی عبادت تغییر خلق اللہ ہے۔ (ز)

737- یہ الفاظ بہت قابل غور ہیں نہ صرف **شیاطین الجن کے وعدے** ہی سراسر جھوٹ اور فریب ہوتے ہیں بلکہ شیاطین الانس جب لوگوں کو غلط راہ پر لگاتے ہیں تو وہ بھی جھوٹے وعدے دے کر ہی ایسا کرتے ہیں۔ جو شخص دوسرے کو بدی کی ترغیب دیتا ہے وہ اس کو خوب سجاتا ہے اور اکثر لوگ بدوں کی صحبت میں بیٹھ کر اسی لیے تباہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔

حَقًّا ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

اور اللہ سے بڑھ کر کون بات کا سچا ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾

نہ تمہاری خواہشوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی خواہشوں پر جو کوئی بدی کرے گا اس کا بدلہ اسے دیا جائے گا اور اللہ کو چھوڑ کر وہ نہ کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار پائے گا۔ (738)

وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾

اور جو نیک کام کرے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (739)

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

اور دین میں اس سے اچھا کون ہے جس نے اپنی ساری توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا اور وہ احسان کرنے والا ہے۔ اور راست رو ہو کر ابراہیم کے مذہب کی پیروی کرتا ہے اور اللہ نے ابراہیم کو (اپنا) پیارا بنایا۔ (740)

738- کیسا پاک مذہب ہے۔ آرزوؤں اور خواہشات پر اجر نہیں ملتے خواہ مسلمان ہوں خواہ یہود و نصاریٰ۔ جو مسلمان نام کو مسلمان کہلاتے ہیں اور قرآن شریف کو اپنا دستور العمل نہیں بناتے وہ محض امانی کے پیرو ہیں اور قرآن کریم کی یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ نری آرزوؤں سے کچھ نہیں بنتا، جب تک اعمال ساتھ نہ ہوں۔ مسلمان ہو کر برا کام کرے گا تو وہ بھی سزا پائے گا۔ غیر مذہب کا آدمی اچھا کام کرے گا تو اس کا اجر پائے گا۔ صحیح اعتقاد عمل سے مستغنی نہیں کرتا بلکہ اعتقاد صحیح کی اصل غرض ہی عمل صحیح پر قائم کرنا ہے۔

739- **مرد اور عورت میں نتائج اعمال کے لحاظ سے کامل مساوات ہے:** پس جس طرح مرد کے لیے نعمائے جنت ہیں اسی طرح اور وہی نعمائے جنت عورت کے لیے بھی ہیں۔ قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ نہ کہیں یہ فرمایا ہے کہ مرد کے لیے عورت کی نسبت زیادہ انعامات ہیں۔ پس اگر عیسائیوں نے اسلام پر یہ جھوٹا الزام دیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت کی روح ہی نہیں تو خود مسلمان بھی اس غلط فہمی میں ہیں کہ بہشت میں جو انعامات مرد کے لیے ہیں۔ وہ عورت کے لیے نہیں۔ قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کے متعلق مرد اور عورت میں مساوات کامل رکھی ہے۔

740- خَلِيْلٌ خُلَّةٌ سے ہے جس کے معنی محبت ہیں کیونکہ وہ نفس کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور خلل اس شگاف کو کہتے ہیں جو دو چیزوں

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع 18 11 15

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

وَ یَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِیْهِنَّ ۙ وَ مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ فِیْ یَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِیْمًا ﴿۱۲۷﴾

اور تجھ سے عورتوں کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہیں کہہ اللہ تم کو ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے ان عورتوں کے یتیموں کے بارے میں ہے جن کو تم جو کچھ ان کے لیے اور ناتواں بچوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے نہیں دیتے ہو اور نہیں چاہتے ہو کہ ان کے نکاح کرو اور یہ کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہو اور جو کچھ بھلائی تم کرو تو اللہ اسے جاننے والا ہے۔ (741)

کے درمیان ہو یا وسط کو ﴿فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ﴾ [النور: 43:24] ''پھر تو بارش کو اس کے اندر سے نکلتے ہوئے دیکھتا ہے۔'' ﴿فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ﴾ [بنی إسرائیل: 5:17] ''پس وہ شہروں کے اندر گھس گئے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا۔ جب بندہ اپنے مالک سے محبت کرتا ہے تو مالک بھی اپنے بندہ سے محبت کرتا ہے لیکن یہاں جو خوشخبری سنائی ہے وہ یہ نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا بلکہ یہ ہے کہ جو کوئی شخص بھی اس ملت ابراہیمی پر چلتا ہے اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں لگا دیتا ہے اور مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرتا ہے، وہی خلیل اللہ یا اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔

اتباع ملت ابراہیمؑ سے کیا مراد ہے؟

یہاں ملت ابراہیم صرف حنیفیت کو کہا ہے یعنی ان اصول دین کو جو افراط و تفریط سے پاک تھے [دیکھو نمبر: 170]۔ اور یہاں وہ اصول دین بھی بتا دیئے یعنی ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ [البقرة: 112:2] اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوق خدا سے احسان پس انہی اصول میں جو اسلام کے بھی اصل الاصول ہیں اتباع مراد ہے۔ اپنی اصلی حالت میں اصول سب مذاہب کا ایک ہی تھا۔ یعنی خدائے واحد کی پرستش اور مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم۔

741- یَسْتَفْتُوْنَ۔ یُفْتِیْ۔ فَتْیٰ کے معنی نوجوان اور فتویٰ جواب ہے ایسے احکام سے جو مشکل ہوں۔ (غ) اور استفتاء ایسے مسائل میں

وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ

اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح اچھی چیز ہے اور طبیعتوں میں بخل ہوتا ہی ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ کرو

فتویٰ مانگنا ﴿اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ﴾[النمل: 32:27] ''میں کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی۔'' ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ﴾[الصافات: 11:37] ''تو ان سے پوچھ۔''

يَتٰمَى النِّسَآءِ کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں۔عورتوں کے یتیم بچے یعنی بیوہ عورتوں کے اور یتیم عورتیں۔اور لسان العرب میں ہے کہ یتیم اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا خاوند نہ ہو۔اور دوسری قراءت اس کی يُيَامَى النِّسَاءِ ہے اور يَيَامٰى۔ اَيِّمٌ کی جمع ہے یعنی وہ عورت جس کا خاوند نہ ہو اور اس کی جمع ایامیٰ قرآن شریف میں آتی ہے ﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى﴾[النور: 32:24] ''اور جو مجرد ہیں ان کے نکاح کردو۔''

﴿مَا كُتِبَ لَهُنَّ﴾ جو حصہ ان کے لیے مقرر ہوا ہے اس سے مہر مراد نہیں بلکہ میراث کا حصہ مراد ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی کمزور بچوں کا بھی ذکر ہے۔عورتوں اور بچوں کو عرب لوگ میراث نہ دیتے تھے جیسا کہ [نمبر: 612] میں ذکر ہو چکا ہے اس لیے جب قرآن شریف میں عورتوں اور بچوں کے ورثہ پانے کا حکم آیا تو بعض لوگوں کو ناگوار گزرا۔(ج)

﴿تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ﴾ رَغِبَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 165] یہاں صلہ کوئی نہیں اس لیے دونوں معنی ہو سکتے ہیں کہ ان کے نکاح میں رغبت کرتے ہو اور یہ کہ ان کے نکاح نہیں چاہتے۔ابن جریر نے دونوں قسم کی روایات بیان کی ہیں مگر کثرت دوسرے معنی کی طرف ہے اور سیاق بھی یہی چاہتا ہے اس لیے کہ مال کا ورثہ لینے کے لیے وہ نہ چاہتے تھے کہ ایسی عورتیں نکاح کریں۔

مسئلہ تعدد ازدواج پر مزید روشنی:

اس رکوع کا تعلق ابتدائے سورت سے ہے اور اس میں اسی مضمون تعدد ازدواج کا ذکر ہے جس کا ذکر سورت کے شروع میں کیا تھا [آیت نمبر: 129] اس امر کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔جہاں فرمایا کہ تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے۔پچھلے رکوع سے اس کا تعلق یہ ہے کہ وہاں منافقوں کے ذکر میں جو شرک کی طرف جا رہے تھے مومنوں کا ذکر کر کے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اس کی مخلوق سے احسان یہی دو ستون مذہب کے ہیں، اس لیے اس رکوع میں پھر عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا کہ ان سے احسان کرو۔

اس آیت کے شروع میں استفتاء اور افتاء کے الفاظ اختیار فرما کر اشارہ کیا ہے کہ لوگوں کو عورتوں کے مسئلہ میں ابھی کچھ مشکلات

تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ تو اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ (742)

نظر آتی ہیں اور سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے جو آگے آتا ہے اور دوسرے ﴿مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ﴾ کا حوالہ دیا ہے یعنی جو اس سورت میں پہلے پڑھا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت بعد میں نازل ہوئی۔ اور جو پہلے پڑھا جاتا ہے اس کے متعلق فرمایا کہ وہ ﴿يَتٰمَى النِّسَآءِ﴾ کے بارہ میں ہے۔ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اس سے مراد یتیم لڑکی ہے جس کا ولی اس کے مال کو اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہے اور نہ خود اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے نہ دوسرے سے نکاح کرنا پسند کرتا ہے۔ اس خوف سے کہ اس طرح وہ مال اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت ام کحت کے بارہ میں نازل ہوئی جس کے یتیم بچے تھے۔ حق یہ ہے کہ قرآن کریم عورتوں اور یتیم بچوں کے معاملہ میں زیادہ تاکید اور تصریح فرماتا ہے اور سورت کے اصل مضمون کو یاد دلاتا ہے۔ عورتوں اور یتامیٰ سے اس قدر بدسلوکی ہوتی تھی کہ پھر اس حکم کے نزول کی ضرورت پیش آئی۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ حکم جو پہلے دیا جا چکا ہے کہ تم دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کر لو، وہ یتامی النساء کے بارہ میں ہے۔ یعنی ایسی عورتوں کے بارہ میں جو بلا خاوند رہ گئی ہیں۔ جیسا کہ جنگوں میں بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں اور یا اگر یتامیٰ النساء کے دوسرے معنی لیے جائیں یعنی عورتوں کے یتیم بچے تو [آیت نمبر: 3] کے معنی یوں ہوں گے کہ عورتوں کے یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکو تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جو ان کی مائیں ہیں جس سے تعدد ازدواج کے مسئلہ کی صراحت ہوتی ہے کہ یہ مشکلات پیش آمدہ کے حل کرنے کے تھا۔ جب بہت عورتیں بلا خاوند رہ گئیں یا یتیم بچوں والی عورتیں رہ گئیں جن یتیموں کا کوئی خبر گیر نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایسی عورتوں سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو اور یہ امر کہ یہاں اسی مسئلہ تعدد ازدواج کی طرف اشارہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کے بعد عدل کا ذکر صفائی سے کیا ہے اور یہ جو فرمایا کہ ان کو تم ان کا مقرر حصہ نہیں دیتے نہ چھوٹے بچوں کو۔ تو اس میں عرب کے اس پرانے دستور کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کو محروم الارث کرتے تھے اور ﴿تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ﴾ [127] سے معلوم ہوتا ہے کہ بوجہ ان کی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری کے وہ ان سے نکاح بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اسلام نے دونوں حکم دیئے کہ عورتوں اور کمزور بچوں کو حق ورثہ بھی دیں اور ایسی عورتوں سے جن کے یتیم بچے رہ گئے ہیں نکاح بھی کر لیں۔ اور اس کے لیے تعدد ازدواج کی بھی اجازت دی۔ کیونکہ اس صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جاتی تو قوم تباہ ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ہی آخر پر یہ کہہ کر یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر قائم رہو، اسی کی تاکید کی ہے۔ بیوہ عورتوں کی خبر گیری اور یتیم بچوں کی پرورش دونوں کا تقاضا تھا کہ یہ صورت اختیار کی جاتی۔

742- شُحٌّ اس بخل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حرص جمع ہو ﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ﴾ [الحشر: 9:59] ''اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے۔'' ﴿اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ﴾ [الأحزاب: 19:33] ''مال کے بخل سے تم پر طعن کرتے ہیں۔'' (غ)

وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

اور تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کرسکو خواہ کتنا ہی چاہو۔ پس بالکل بھی نہ جھک جاؤ یہاں تک کہ اسے اَدھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو۔ اور اگر تم اصلاح کرلو اور تقویٰ کرو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (743)

خاوند کا نشوز عورت پر:

یہاں اس صورت کا ذکر کیا جب عورت کو خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو۔ جب بیوی کی طرف سے نشوز ہو یا ﴿شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ کی صورت ہو یعنی میاں بیوی میں جھگڑا ہو، تو ان دونوں صورتوں کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔ اس خاص صورت کا ذکر کہ عورت کو خاوند کی طرف سے خوف ہو تو تعدد ازدواج کے جھگڑے سے ہی وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی لیے ان دونوں حکموں سے الگ کر کے اس کو یہاں بیان کیا اور اگلی آیت میں تو واضح طور پر بیویوں میں عدل کا ذکر کر کے اس مضمون کو کھول دیا۔ فرمایا کہ جب خاوند کی دوسری شادی کرنے سے عورت کو یہ خوف ہو کہ وہ اس کی طرف سے بالکل بے رغبت ہو جائے گا یا اس پر زیادتی کرے گا تو وہ دونوں کوئی صورت صلح کی اختیار کریں۔ اور وہ صورت یوں بھی ہو سکتی ہے کہ خاوند ہی ازدواج ثانی کے ارادہ کو ترک کر دے یا یہ کہ عورت کا اطمینان کر دے کہ اس کو نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ بھی فرمایا کہ صلح بہتر چیز ہے لیکن صلح کے ہونے میں شُحّ مانع ہو جاتا ہے۔ یعنی بخل وحرص۔ بخل تو یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی حق کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور حرص یہ کہ کسی دوسرے کا حق چھیننا چاہتا ہے۔ اگر یہ بخل وحرص نہ ہوں اور انسان کچھ اپنے حقوق کو چھوڑ دے اور کچھ دوسرے کے حقوق پر دست درازی کو چھوڑ دے تو صلح آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ احسان وتقویٰ کی ہدایت فرمائی۔ یعنی دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے حقوق لینے سے بچو اور یہاں بالخصوص مراد عورتوں کے ساتھ معاشرت میں احسان کرنا اور ان کی حق تلفی سے یا ان پر نشوز کرنے یا ان سے اعراض کرنے سے بچنا ہے۔

743- تَمِيْلُوْا۔ مَيْلٌ وسط سے ایک جانب جھک جانے کا نام ہے اور اس کا استعمال ظلم میں ہوتا ہے اور مِلْتُ عَلَيْهِ کے معنی ہیں اس پر حملہ کیا۔ ﴿فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً﴾ [النسآء: 102:4] ''تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔'' اور مال کو مَالٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوسری طرف جھکتا یعنی دوسرے ہاتھوں میں جاتا رہتا ہے، آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے۔ (غ)

مُعَلَّقَةِ۔ عَلَقَ کسی چیز کے ساتھ لٹک جانا یا اس میں پھنس جانا ہے۔ (غ) اسی سے عَلَقَةٌ ہے جس سے بچہ بنتا ہے اور مُعَلَّقَةٌ کے معنی ہیں [اَلَّتِيْ فُقِدَ زَوْجُهَا] (ل) یعنی جس کا خاوند گم ہو گیا ہو۔ [لَا أَيِّمَ وَلَا ذَاتُ بَعْلٍ] نہ وہ بلا خاوند ہو اور نہ خاوند والی۔ (ل)

وَ اِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِیْمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا حکمت والا ہے۔ (744)

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ﴿۱۳۱﴾

اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہم نے ان کو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی یہی حکم دیا کہ اللہ کا تقویٰ کرو اور اگر تم انکار کرو تو جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے اور اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

مرد کا عورتوں میں عدل کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے:

ایک ظاہر حالات میں یعنی خرچ دینے میں، باری میں۔ دوسرا محبت میں۔ سورت کے شروع میں فرمایا تھا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ضرورت کی حالت میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرو۔ بلکہ ایک پر ہی اکتفا کرو۔ وہ عدل حالات ظاہر میں ہے یہاں خاوند اور بی بی میں رغبت اور محبت کا ذکر ہے۔ اس لیے ﴿وَ لَنْ تَسْتَطِیْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا﴾ میں جس عدل کی عدم استطاعت کا ذکر ہے وہ عدل تعلقات محبت میں ہے اور بتایا ہے کہ یہ انسان کی طاقت میں ہی نہیں کہ اگر دو بیبیاں اس کے گھر میں ہیں تو دونوں سے یکساں محبت کر سکے۔ عدل ظاہری کی نفی یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو انسان کر سکتا ہے۔ یہ خیال کہ تعدد ازدواج کی اجازت دے کر پھر اسے ایک محال شرط سے وابستہ کر دیا ہے اور خود ہی اس شرط کو محال قرار دے دیا ہے صحیح نہیں۔ اس لیے کہ تعدد ازدواج کی اجازت تو ایک خاص مشکل کو حل کرنے کے لیے دی تھی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور خدا کے کلام کو یہ شایاں نہیں کہ خود ایک ضرورت کو بیان کرے پھر خود ہی اس کے پورا کرنے کو ایک محال شرط سے وابستہ کر دے۔ اگر ضرورت تعدد ازدواج کی ہے تو پھر اس کا انکار اس بنا پر نہیں ہو سکتا کہ تم عدل نہیں کر سکتے۔ کیا یہ خود خدا تعالیٰ پر اعتراض نہیں کہ ایک طرف تعدد ازدواج کی ضرورت کو بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تعدد ازدواج کو ایک شرط محال سے وابستہ کرتا ہے۔ اس آیت کے معنی صاف ہیں کہ عدل ظاہری کا حکم تو ہم دے چکے ہیں۔ محبت میں مساوات کے لیے ہم تم کو مجبور نہیں کرتے۔ ہاں ایک عورت کی طرف اس قدر بے رغبتی کرنا کہ وہ نہ خاوند والیوں میں داخل ہو نہ بغیر خاوند والیوں میں۔ اُدھر میں لٹکی ہوئی ہو۔ اس سے منع فرمایا۔

744- اگر بے رغبتی اس حد تک بڑھ جائے یا میل موافقت نہ ہو سکے تو دونوں کا جدا ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ دونوں کو پہلے سے بہتر حالت میں کر سکتا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ﴿۱۳۲﴾

اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کارساز بس ہے۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِیْرًا ﴿۱۳۳﴾

اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور اوروں کو لے آئے اور اللہ اس پر قادر ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع 19 8 16

جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے ہاں دنیا اور آخرت (دونوں) کا ثواب ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ (745)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۳۵﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف پر قائم ہونے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو گو (معاملہ) تمہاری اپنی ذات یا ماں باپ اور قریبیوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا (تمہاری نسبت) زیادہ خیر خواہ ہے سو تم خواہش کی پیروی نہ کرو تا کہ عدل کر سکو اور اگر تم پیچدار بات کرو یا (حق سے) اعراض کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔ (746)

745- خاتمہ کی چار آیات میں تقویٰ کی تاکید فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی جبروت وقدرت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ یہی چیز انسان کو تقویٰ پر قائم رکھ سکتی ہے دوسروں کے حقوق کی صحیح رعایت انسان تب ہی کر سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی قدرت و جبروت پر ایمان ہو، ورنہ نیکی بھی خود غرضی کا رنگ رکھتی ہے۔

746- قَوّٰمِیْنَ۔ قِیَامٌ کا استعمال دو طرح پر ہے کسی چیز کی مراعاۃ یا نگہداشت اور اس کی حفاظت اور دوسرا کسی چیز کا عزم اور یہاں مراد مراعاۃ ہے۔ (غ) اور قَوَّامٌ چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے مراد ہے مراعاۃ انصاف کو کمال تک پہنچانے والا اور چونکہ قِسْطٌ انصاف کا حصہ ہے اس لیے مراد ہر قسم کے حقوق کی ادائیگی میں پوری مراعاۃ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں

﴿شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ اللہ کے لیے گواہی دینے والے یعنی گواہی میں ایسی حق بات کہنے والے کہ سوائے اللہ کی رضا کے اور کچھ مدنظر نہ ہو۔

﴿اَوْلٰى بِهِمَا﴾ اَوْلٰى بمعنی اَحْرٰی ہے۔ بڑھ کر اہل یا حقدار۔ اور مطلب یہ ہے کہ غنی کی رضا حاصل کرنا یا فقیر پر رحم کرنا حق سے تمہیں نہ پھیر دے کیونکہ غنی کے معاملہ میں اللہ کی رضا اور فقیر کے معاملہ میں اللہ کا رحم اس سے بڑھ کر ہے۔

تَلْوٗۤا۔ لَوِیَ کے معنی جھوٹ بولنا بھی ہیں اور مائل ہونا بھی۔ چونکہ دو حکم اکٹھے ہیں یعنی انصاف کرنا اور سچی شہادت دینا۔ اس لیے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جس سے دونوں مطلب نکلتے ہیں۔ یعنی شہادت کے معاملہ میں جھوٹ بولو یا عدل سے ایک طرف مائل ہو جاؤ۔

عدل وانصاف پر قیام کی نصیحت:

اصل ذکر تو منافقوں کا تھا اور اسی میں مشرک اور موحد کا مقابلہ کرتے ہوئے عورتوں کے معاملہ میں عدل وانصاف کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس آیت میں اسی کو عام کیا ہے اور دوسری طرف چونکہ ذکر منافقوں کا تھا اسی لیے فرمایا کہ ایمان والوں کو چاہیے کہ انصاف کے قَوّٰمٌ بنیں یعنی اس کو ہمیشہ مضبوطی سے قائم رکھنے والے اور ہر ایک قسم کے حقوق پورے انصاف سے ادا کرنے والے۔ فیصلہ کرنا صرف ایک موقعہ پر ہے جو بعض انسانوں کو پیش آتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ تمام قسموں کے حقوق کی ادائیگی پر حاوی ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ فیصلہ کا وقت سب سے زیادہ انسان کے لیے آزمائش کا وقت ہے۔ دوسری جگہ یوں فرمایا کہ ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ [المآئدۃ: 8:5] کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے بھی عدل کے مقام سے نہ ہٹو۔ یہ مشکل سے مشکل مقام عدل کا ہے۔ انسان کی اپنی ذات یا اقربا کا معاملہ ہو یا کسی قوم سے عداوت ہو تو وہاں عدل قائم رکھنا مشکل ہے۔ ایسا ہی شہادت حقہ کا ادا کرنا ایک مشکل بات ہے۔ بالخصوص جہاں اپنی ذات پر اس کا اثر پڑتا ہو یا ماں باپ یا قریبیوں پر۔ پھر بعض وقت انسان ایک امیر آدمی کے لحاظ سے انصاف اور شہادت حقہ کو چھوڑ دیتا ہے تاکہ اسے خوش کرے اور بعض وقت ایک غریب پر رحم کر کے۔ فرمایا تم دونوں باتوں کی پروانہ کرو۔ اللہ کا حق ان پر تمہاری نسبت زیادہ ہے۔ اور اللہ کا حق یہی ہے کہ حق ظاہر ہو اور کسی کی رعایت نہ ہو۔

عدل کی صفت سے انسان تب ہی متصف ہوتا ہے جب خواہشات کی پیروی ترک کر دے اس لیے بتایا کہ اس مقام پر پہنچنے کا

وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

اور پچھلے دن کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دور نکل گیا۔ (747)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھ گئے۔ تو اللہ یہ نہیں کہ ان کی مغفرت کرے اور نہ یہ کہ ان کو راہ پر سیدھا چلائے۔ (748)

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ﴿۱۳۸﴾

منافقوں کو خبر دے دے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ کیا وہ ان کے ہاں عزت چاہتے ہیں؟ تو عزت سب اللہ کے لیے ہی ہے۔

طریق یہی ہے کہ تم خواہشات کی پیروی چھوڑ دو۔

747- پہلے ایمان سے مراد ایمان ظاہر یا اقرار باللسان ہے اور دوسرے ایمان سے مراد تکمیل ایمانی ہے جس میں تصدیق بالقلب اور اس کے مطابق عمل بھی شامل ہیں۔ [دیکھو نمبر: 11]۔ چونکہ اصل ذکر منافقین کا تھا اس لیے فرمایا کہ صرف منہ کا ایمان فائدہ نہیں دیتا جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

748- اس سے مراد منافق ہی ہیں۔ چنانچہ اگلی آیت میں تصریح موجود ہے۔ ایمان لانے، پھر کافر ہونے، پھر ایمان لانے، پھر کافر ہونے سے مراد دو دفعہ کی گنتی ہی نہیں بلکہ ان کے تردد کا ظاہر کرنا مقصود ہے اور یہ تردد بعض منافقوں کی صورت میں ظاہر میں بھی واقع ہوتا تھا اور بعض کی صورت میں صرف باطن میں تھا ﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ آخری حالت ان کی یہ ہے کہ کفر میں ترقی کرتے چلے گئے۔ ایسوں کی حفاظت اور ہدایت اللہ تعالیٰ نہیں کرتا۔ اس لیے کہ جب ایک شخص غلط راہ کو اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مجبور کر کے نیک کام کی طرف نہیں لاتا جیسے نیک کو مجبور کر کے بدی کی طرف نہیں لے جاتا۔

وَ قَدۡ نَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الۡكِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكۡفَرُ بِهَا وَ يُسۡتَهۡزَاُ بِهَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا مَعَهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖ ‌ۖ اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَ الۡكٰفِرِيۡنَ فِىۡ جَهَنَّمَ جَمِيۡعَاۨ ۙ‏ ﴿۱۴۰﴾

اور وہ تم پر کتاب میں (یہ حکم) نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے اور ان پر ہنسی کی جاتی ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی دوسری بات میں لگ جائیں، ضرور تم بھی اس وقت انہی کی طرح ہو۔ اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے۔ (749)

الَّذِيۡنَ يَتَرَبَّصُوۡنَ بِكُمۡ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَكُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَكُنۡ مَّعَكُمۡ ‌ۖ وَ اِنۡ كَانَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نَصِيۡبٌ ۙ قَالُوۡۤا اَلَمۡ

وہ جو تمہارے متعلق انتظار میں ہیں۔ پس اگر تم کو اللہ کی طرف سے فتح ملے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم کو

749- يَخُوۡضُوۡا۔ خَوۡضٌ کے معنی پانی میں رستہ بنانا اور اس میں گزرنا ہیں۔ اور معاملات یا باتوں میں داخل ہونے پر استعارۃً بولا جاتا ہے اور اکثر استعمال اس کا ذم کے مقام میں ہے ﴿كُنَّا نَخُوۡضُ وَ نَلۡعَبُ﴾ [التوبة: 65:9] ''یوں ہی باتیں اور دل لگی کرتے تھے۔'' ﴿وَ خُضۡتُمۡ كَالَّذِىۡ خَاضُوۡا﴾ [التوبة: 69:9] ''اور تم بیہودہ باتوں میں لگے رہے جیسے وہ لگے رہے۔'' (غ) یعنی بیہودہ یا جھوٹی باتوں میں پڑنا۔ اور خَوۡضٌ کلام میں وہ ہے جس میں کذب اور باطل ہو۔ (ل)

یہ حکم پہلے سورۃ الانعام میں نازل ہو چکا ہے ﴿وَ اِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖ﴾ [الأنعام: 68:6] ''اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں کے متعلق بیہودہ باتیں کرتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے۔ یہاں تک کہ اس کے سوائے کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔'' مکہ میں مشرکین عرب اپنی مجالس میں قرآن کریم پر ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے۔ مدینہ میں یہودی اور منافق۔ روکنے کی وجہ یہاں بتا دی ہے کہ اس صورت میں بھی تم ان جیسے ہو گے۔ جب انسان ایک چیز کے متعلق استہزا کا طریق اختیار کرتا ہے تو جو شخص اس استہزا کو خوش ہو کر سنتا ہے اس کا قلب بھی اسی رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے۔ یوں کفار کے ساتھ بیٹھنے سے، بات چیت کرنے سے منع نہیں کیا۔ مگر اصول دین اور ائمہ دین کی تحقیر اور ان پر استہزا سننے سے روکا۔ بالمقابل مسلمانوں کو یہ بھی تعلیم دی کہ تم ان کے معبودوں کی تحقیر و تذلیل نہ کرو ﴿وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ [الأنعام: 108:6] ''اور ان کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں۔'' اصل میں منافقین کفار کے ساتھ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی ہنسی اڑایا کرتے تھے مسلمانوں کو روکا کہ ان کے دام میں نہ آ جائیں۔

نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع 20 7 17

چڑھا نہیں لائے؟ اور مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی؟ سو اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر (غلبہ کی) راہ نہیں دے گا۔ (750)

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ

منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ ان کو دھوکا بازی

750- يَتَرَبَّصُوْنَ۔ رَبَصَ مادہ ہے اور تَرَبَّصَ کسی شے کے انتظار کو کہتے ہیں۔ سامان تجارت ہو تو اس کے مہنگا ہونے یا ارزاں ہونے کا انتظار یا کسی معاملہ میں اس کے حصول یا زوال کا انتظار ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ﴾ [البقرة: 228:2] ''اور طلاق دی ہوئی عورتیں انتظار میں رکھیں۔'' ﴿تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ﴾ [الطور: 31:52] ''انتظار کرو کہ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

نَسْتَحْوِذْ۔ حَوِذَ کے معنی ہیں اونٹ کا چلانے والا اس کے چوتڑوں پر مار مار کر اس کو چلائے اور حَاذَ الْاِبِلِ کے معنی ہیں اونٹوں کو سختی سے چلایا اسی سے اِسْتَحْوَذَ ہے۔ ﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ﴾ [المجادلة: 19:58] کے معنی ہیں ''شیطان نے ان پر غالب آ کر ان کو چلایا۔'' یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ ہم تم کو بڑی ترغیب دے کر اور بڑا زور دے کر مسلمانوں پر چڑھا کر لائے۔

نَمْنَعْ۔ مَنْعٌ اصل میں عطاء یعنی دینے کی ضد ہے جیسے: ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ﴾ [قٓ: 25:50] ''نیکی سے روکنے والے۔'' ﴿وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾ [الماعون: 7:107] ''اور خیرات کو روکتے ہیں۔'' اور حمایۃ یا حفاظت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہی معنی یہاں ہیں۔ (غ)

یہاں منافقوں کی دورخی چال کا ذکر کیا ہے۔ ایک طرف مومنوں کے ساتھ ملے رہتے ہیں انہیں غلبہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ تھے۔ دوسری طرف کافروں کے ساتھ۔ جب کسی جنگ میں کچھ فائدہ کافروں کو ہو جاتا ہے تو ان کو جتاتے ہیں کہ ہم ہی تمہارے اس فائدہ کا اصل موجب ہیں۔ کیونکہ ہم ہی تم کو چڑھا کر لائے اور ہم نے پھر مومنوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہارا ان سے بچاؤ کر دیا۔ یعنی وہ اس قابل نہ رہے کہ تم پر حملہ کر سکتے اور یوں تمہارا بچاؤ ہو گیا۔ پس جو کچھ تم کو حاصل ہوا صرف ہماری وجہ سے ہی حاصل ہوا ہے۔ یہ ان کی شرارتیں ہیں جن کی وجہ سے ان کو اگلے رکوع میں انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔

ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لڑائی کے اتار چڑھاؤ میں جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہو رہی تھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کامیابی کے لیے لفظ فتح اختیار فرمایا اور کفار کے لیے لفظ نصیب یعنی کچھ تھوڑا حصہ جس سے معلوم ہوا کہ کفار کو مسلمانوں کے مقابل پر فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ ہاں کچھ تھوڑی تکلیف مسلمانوں کو پہنچ گئی۔

خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ

کی سزا دے گا۔[751] اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھاتے

751- يُخٰدِعُوْنَ۔ خَادِعٌ۔ يُخٰدِعُوْنَ یا مُخَادَعَةٌ سے مراد ہے دھوکا دینا چاہتے ہیں[دیکھو نمبر: 21] اور خَادِعٌ اسم فاعل ثلاثی سے ہے یعنی خَدَعَ سے جس کے معنی ہیں [خَتَلَهُ وَ اَرَادَ بِهِ الْمَكْرُوْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُ] (ت) یعنی اسے چھپ کر آ لیا اور اس سے ایسے معاملہ کا ارادہ کیا جسے وہ ناپسند کرتا ہے ایسے طریق سے جسے وہ نہیں جانتا۔ گویا اس کے اصل معنی ہیں چھپ کر امر مکروہ کا وارد کرنا۔

خدع کی نسبت اللہ کی طرف:

پس اس تشریح کو مدنظر رکھتے ہوئے جو[نمبر: 27] میں کی گئی ہے کہ جب ایک فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس میں صرف اس فعل کا نتیجہ باقی رہ جاتا ہے اور ذریعہ جس سے وہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے مفقود ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف فعل خَدَعَ منسوب کرنے کا منشا صرف اس قدر ہوا کہ وہ ان پر ایسا امر وارد کرے گا جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور یا برطبق ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾[الشوریٰ: 40:42] ''بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔'' معنی یہ ہیں کہ وہ ان کو ان کے خدع کی سزا دے گا۔ (ل) اور مُخَادَعَةٌ کے مقابل پر جب خَدَعْتُهُ کہیں تو مراد ہوتی ہے ظَفِرْتُ بِهٖ (ل) یعنی میں اس پر غالب آیا اور ان تینوں میں سے کوئی سے معنی لیے جائیں مطلب وہی ہے اور خدع کا استعمال لغت میں وسیع ہے۔ خَدَعَتِ الضَّبُّ کے معنی ہیں گوہ چھپ گئی۔ اور [خَدَعَ الرِّيْقُ فِي الْفَمِ] کے معنی ہیں تھوک خشک ہوگئی اور [كَانَ فُلَانٌ الْكَرِيْمُ ثُمَّ خَدَعَ] میں خَدَعَ کے معنی اَمْسَكَ یعنی رک گیا۔ [خَدَعَ الْمَطَرُ] کے معنی ہیں بارش تھوڑی ہوئی اور [اَلسِّنْوَانُ الْخَوَادِعُ] کے معنی ہیں قحط کے سال جن کی خیر کم ہے کیونکہ بارش نہیں ہوتی اور حدیث میں جو آتا ہے [اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ] تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جنگ میں دھوکا کھا گیا تو اس کا قدم پھسل جاتا ہے۔ یعنی دشمن کے مخفی وار سے اپنا بچاؤ کرنا چاہیے اور یا یہ لفظ خُدْعَةٌ ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے اہل کو دھوکہ دینے والی چیز ہے۔ (ن)

پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کی دھوکہ بازی کا ذکر کیا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کے دشمنوں کو ان پر چڑھا کر لاتے اور پھر کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں تو فرمایا کہ یہ مومنوں کو اس طرح دھوکہ دے کر گویا خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر وہ دھوکہ دے نہیں سکتے بلکہ آخر کار مغلوب ہو کر خود نقصان اٹھائیں گے۔ سورہ بقرہ کے شروع میں منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾[البقرۃ: 9:2] ''وہ اللہ کو اور ان کو جو ایمان لائے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔'' اور یہاں صرف ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ہے۔ مگر مطلب ایک ہے۔ وہاں اس کی سزا بیان فرمائی تھی ﴿وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ﴾[البقرۃ: 9:2] خدا کو کیا دھوکہ دینا ہے بلکہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہاں بجائے ان الفاظ کے فرمایا ﴿وَ هُوَ خَادِعُهُمْ﴾ مطلب وہی ہے کہ آخر اس دھوکہ بازی کا برا نتیجہ پا کر رہیں گے۔

اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝١٤٢
ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم۔ (752)

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ ۭ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝١٤٣
درمیان میں پریشان ہیں نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے۔ اور جس کو اللہ (تعالیٰ) گمراہی میں چھوڑ دے تو تُو اس کے لیے ہرگز راہ نہ پائے گا۔ (753)

752- کُسَالٰی۔ کَسْلَانُ کی جمع ہے اور کسل کے معنی ہیں کاہلی یا بوجھل ہونا ایسے معاملہ میں جس میں سستی مناسب نہیں۔ (غ)
یُرَآءُوْنَ۔ رَاٰی کے معنی دیکھا اور مُرَاءَۃٌ یا رَآءٌ دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا۔ (غ) یعنی ایک کام کا کرنا اس غرض کے لیے کہ دوسرے لوگ دیکھ لیں۔

نماز میں کسل اور راحت:

جب منافقوں کی مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ بازی کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بتایا کہ وہ نماز میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف آتے ہیں تو اس کی غرض بھی صرف دھوکہ بازی ہے یعنی لوگ یہ خیال کریں کہ یہ مسلمان ہیں۔ اس لیے نماز میں خوش دلی یا شرح صدر کس طرح پیدا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک نماز میں انشراح اور خوشی کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ نماز صرف دکھاوے کی ہے۔ نماز جو خدا کے حضور حاضر ہونے کا نام اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے اگر اس میں ایسی کشش اور جذب پیدا نہ ہو کہ اس کی طرف انسان کھچا ہوا چلا جائے تو اس کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا اور بوجھ کے طور پر چند رکعت کا ادا کر لینا منافقوں سے مماثلت ہے۔ صحیح ایمان کا نشان یہ ہے کہ نماز میں راحت محسوس ہو اور وہ کیفیت پیدا ہو جس کا ذکر [قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ] (سنن النسائی، کتاب عشرة النساء، باب حُبّ النِّسَاءِ، حدیث:3956) میں ہے۔

753- مُذَبْذَبٌ۔ ذَبٌّ کے معنی دفع کرنا یا روکنا بھی ہیں۔ اور طَرَدَ یا دور کرنا بھی۔ (ل) پس مُذَبْذَبِ وہ ہے جو دونوں طرف سے مطرود ہو۔ (ل) مگر امام راغب کہتے ہیں کہ مُذَبْذَبِ سے مراد مضطرب ہے کیونکہ ذَبْذَبَةٌ جو اصل میں ہوا میں لٹکی ہوئی چیز کی آواز پر بولا جاتا ہے۔ ہر ایک اضطراب اور حرکت پر استعارةً استعمال ہوتا ہے۔ (غ) اور ذُبَابٌ (واحد ذُبَابَةٌ) اسی مادہ سے ہے اور مکھی کو کہتے ہیں۔ یہاں بتایا ہے کہ منافق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا ایک طرف چلا جاتا ہے کبھی دوسری طرف۔ ایمان کو اللہ تعالیٰ نے ثبات سے مثال دی ہے اور اس سے اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد: 28:13] ''سن رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔'' اور کلمہ طیبہ کو اس درخت سے مثال دی ہے جس کی جڑ مضبوط ہے ﴿اَصْلُهَا ثَابِتٌ﴾ [إبراهيم: 24:14] ''اس کی جڑ مضبوط ہے۔'' اور کلمہ خبیثہ کو اس سے جس کو قرار نہیں ﴿مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾ [إبراهيم: 26:14] ''اس کو کچھ بھی قرار نہیں۔'' پس یہی معیار ایمان کا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ (کی سزا) کے لیے اپنے خلاف کھلی دلیل بناؤ؟(754)

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ۙ

منافق آگ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں اور تو ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پائے گا۔(755)

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَ سَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

مگر وہ جو توبہ کریں اور اصلاح کریں اور اللہ (کے احکام) کو مضبوط پکڑیں اور اپنی فرمانبرداری کو اللہ کے لیے خالص کریں تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور عنقریب اللہ مومنوں کو بڑا اجر دے گا۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ اور اللہ قدر کرنے والا جاننے والا ہے۔(756)

754- مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ولی بنانے پر [دیکھو نمبر: 399]۔ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا لانا بتاتا ہے کہ یہ بھی ایک نفاق کی علامت ہے اور منافقوں کے ذکر میں پیچھے آ چکا ہے کہ وہ کفار سے تعلقات پیدا کر کے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں اسلام کے دشمنوں سے عزت کا خواہاں ہونا یہ بھی ان کی ولایت ہے۔

755- دَرَكٌ اور دَرَجٌ ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں یعنی اس سے بھی مراد درجہ ہی ہے۔ مگر استعمال میں یہ فرق ہے کہ اوپر کی طرف جانے کے لحاظ سے دَرَجٌ بولا جاتا ہے اور پستی کی طرف جانے کے لحاظ سے دَرَكٌ۔ اس لیے جنت کے درجات ہیں اور دوزخ کے درک اور درک سمندر کی غایت درجہ کی گہرائی کو بھی کہتے ہیں۔ (غ) اسی مادہ سے ادراک وغیرہ الفاظ ہیں۔

منافق ارتکاب کفر بھی کرتا ہے اور چھپ کر اسلام کے ساتھ دشمنی بھی۔ پھر وہ اسلام کی صداقت کے نشان بھی دیکھتا ہے اس لیے سب سے نچلے طبقہ میں ہے ذلیل ترین لوگ دنیا میں بھی وہی ہیں جو منہ سے کچھ کہتے ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ آج مسلمانوں کے اسلام میں کس قدر اخلاص ہے؟ اگلی آیت میں لفظ اخلاص لا کر صاف اس طرف اشارہ کیا ہے۔

756- **عذاب کی غرض اصلاح ہے:** چونکہ منافقوں کا ذکر تھا اور ابھی ان کو یہ کہا گیا تھا کہ ان کے لیے آگ کا سب سے نچلا

طبقہ ہے اس لیے اب بتاتا ہے کہ اس قدر شدید وعید کے باوجود بھی اگر یہ لوگ شکر کریں اور ایمان لائیں تو پھر اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ ان کو عذاب دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عذاب کی اصل غرض انسان کی اصلاح ہے نہ کچھ اور۔ اگر انسان اپنے نفس کی اصلاح خود کر لے تو عذاب بھی ٹل جاتا ہے۔ دوزخ کا عذاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہے جو شکر اور ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ شکر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کی جاتی اور ہر ایک طاقت سے اپنے محل اور موقعہ کے مطابق کام لیا جاتا [دیکھو نمبر: 75] اور ایمان کا یہ تقاضا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کیا جاتا۔